

سید خورشید احمد کیلانی

# روحِ تصوف

اسلام کے مشائی نظام حیات کی ایک جھلک

فریدنگ شال اردو بازار لاہور

## فرید بک سٹال لاہور کی ایک سالہ اشاعتی حدیث ایک نظر میں

## منشورات طلحہ

تصانیف مولانا ابوالنور محمد بشیر کوٹلوی

۱۵/-	طہ روحانی ۶/۹۰	۲۲/-	مجموعہ دوم پانچک	بیات اول
۱۸/-	فتاویٰ عالمگیری ۶۵۰/-	۲۳/-	مجموعہ دوم پانچک	دوم
۶۰/-	جہانہ ابانہ	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	سوم
۲۲/-	زینت و زنجیر اول	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	چہارم
۱۳/۵۰	ذکر باہر	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	پانچواں
۳۰/-	کوزا نجات	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	شانزہم
۵/-	نسیم رحمت	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	ہفتواں
۶۵/-	بشعہ الطہات اول (ترجمہ مولانا محمد سعید نقشبندی)	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	ہشتواں
۲۲/-	مسند امام اعظم	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	نہواں
۱۸/-	تذکرۃ الاولیاء	۲۴/۵۰	مجموعہ دوم پانچک	دہواں
۲۴/-	دلائل المسائل (فقہ اعظم کوٹلوی)	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	گیارہواں
۲۴/-	فقہ الفقہ	۱۶/۵۰	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
۳۶/-	شمع شبستان رضا	۱۸/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
۳۱/۵۰	مجموعہ دوم پانچک	۱۸/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
۱۸/-	روح تصوف (از مستی خورشید احمد گیلانی)	۱۵/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	سال رواں کے اشاعتی منصوبے کے تحت تیار ہونے والے	۱۵/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	اشعہ انعمات	۱۶/۵۰	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	بخاری شریف مکمل مترجم تین جلدوں میں	۱۲/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	ریاض الصائمین مترجم مکمل دو جلدوں میں	۱۵/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	معالجہ سعیدی (مولانا غلام رسول سعیدی)	۱۶/۵۰	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	ابوداؤد شریف	۲۱/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	عظمت اہل سنت کی حکایات (ابوالنور کوٹلوی)	۲۴/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	جامع المعجزات (صاحبزادہ مولانا غلام مصطفیٰ کوٹلوی)	۱۵/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر
	مجموعہ دوم پانچک	۱۵/-	مجموعہ دوم پانچک	بہتر

فرید بک سٹال - ۲۰ - اردو بازار، لاہور

سید خورشید احمد کیلانی

زُجُحِ تَصَوُّفِ

اسلام کے مثالی نظامِ حیات کی ایک جھلک

ریدیکسٹال • ارڈوبازار • لاہور

marfat.com

روح تصوف	_____	نام کتاب
سید خورشید احمد گیلانی	_____	مصنف
عالمین پبلیکیشنز پریس ۲۲/۱۰ ریگیں روڈ لاہور	_____	مطبع
فضل الہی کیلیا نوالہ	_____	کتابت
ایک ہزار	_____	تعداد
۱۹۸۱ء	_____	بار اول
	_____	قیمت

## تقریب

۴	پیش لفظ : سید محمد فاروق قادری	۱
۲۶	پیش گفتار : سید ارشد احمد عارف	۲
۳۴	روح تصوف	۳
۵۵	شریعت و طریقت	۴
۶۴	کشف و کرامات	۵
۷۱	اہم کتب	۶
۹۵	اشاعت اسلام اور صوفیا کرام	۷
۱۰۸	آئین جوان مردی حق گوئی و بے باکی	۸
۱۲۶	فقر غنیور	۹
۱۴۲	تاج شہی فقر کے قدموں پر	۱۰
۱۵۲	تعلیمات تصوف	۱۱
۱۵۶	توکل	۱۲
۱۶۴	فتر	۱۳
۱۶۱	توبہ	۱۴
۱۶۹	تقوای	۱۵
۱۸۵	اخلاص	۱۶
۱۹۰	صبر	۱۷
۱۹۴	فتوت	۱۸
۱۹۹	ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	۱۹
۲۰۶	اشارہ	۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش لفظ

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا میں ہر تحریک بہ تمام و کمال وقت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ کچھ تحریکوں اور افکار کو تو زمانے کی تیز رفتاری پوری قوت سے روند کر اس طرح ملیا میٹ کر دیتی ہے کہ اس کے آثار بھی نہیں ملتے، البتہ جو تحریکیں زیادہ سخت جان ہوتی ہیں وہ دیر تک وقت کے گرداب کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں، دنیا میں کچھ تحریکیں ایسی بھی اٹھی ہیں کہ زمانہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے باوجود انہیں کجلا تک نہیں سکا، اور وہ ہر دور میں ایک نئی تازگی اور زندگی کے ساتھ ابھرتی رہی ہیں۔ جو تحریکیں اس سے کم تر درجے کی ہوتی ہیں وہ تاریخ کے رُخ پر موجود تو رہتی ہیں مگر اپنی اصلی حالت پر نہیں بلکہ رو و بدل، حک و اضنافے اور ترمیم و تغیر کے ساتھ۔

اسلامی تصوف ایک تحریک کے طور پر تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اپنا کام شروع کرتا ہے، اگرچہ اس کی بنیادیں ہمیں عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آتی ہیں، حضرت سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد اور عمار رضی اللہ عنہم دور اول کے وہ نمایاں افراد ہیں جن کی پوری زندگی زہد و عبادت اور تزکیہ نفس کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اہل بصیرت نے محسوس کیا کہ تمام ذرائع دولت اور وسائل عزت پر اہل حرص و ہوانے پوری طرح قبضہ کر لیا ہے۔ مناصب حکومت کی لالچ اور روپے پیسے کی ہوس نے لوگوں کو اس قدر پست ہمت کر دیلے ہے کہ وہ اس کے علاوہ

کچھ سوچ بھی نہیں سکتے اور نہ ہی ان میں اتنا جذبہ باقی رہا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ نصب العین کی خاطر جان و مال کی قربانی دے سکیں یا اپنے عیش و آرام کو چھوڑ سکیں، ان ارباب عزیمت نے محسوس کیا کہ اگر بروقت اس خطرے کا نوٹس نہ لیا گیا تو یہ سیلاب اپنی روانی میں سب کچھ بہا لے جائے گا۔ چنانچہ حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ان میں سے ایک گروہ کسی کا حلیف عرفین بنے بغیر ملک ہو گیا اور اس نے اسلام کی انقلابی تعلیمات کی حفاظت کے لیے مختلف انداز میں کمر باندھ لیا۔ ملوکیت کے دور نامہ تجارت میں اس طرز عمل کی افادیت کھل کر سامنے آنے لگی تو یہ فکر ایک تحریک کی حیثیت اختیار کرنا چلا گیا۔ نتیجہ نکلا کہ تیسری صدی کے اوائل سے ساتویں صدی ہجری تک اسلامی تصوف ایک ہمہ گیر تحریک کی حیثیت سے آگے بڑھتا رہا اور اس نے زندگی کے ہر شعبہ حیات کو متاثر کیا۔ ساتویں صدی ہجری کے بعد اس تحریک میں وہ جان باقی نہ رہی جو ابتدائی قوت اور شدت کی طرح وقت کا مقابلہ کرتی رہتی، دوسری طرف یہ تحریک اتنی پھیل چکی تھی کہ اب یہ ممکن ہی نہ رہا تھا کہ دور دراز کے ممالک میں بسنے والی اقوام کے افکار اور ان کے مخصوص سماجی اثرات سے یہ پوری طرح اپنا دامن بچا سکے۔

تصوف ایک علیحدہ تحریک کے طور پر کبھی وجود میں نہ آتا اگر مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے بعد دین و دنیا کی تفریق کا سانحہ پیش نہ آتا۔ اس نازک موڑ پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پارہ پارہ ہو کر رہ گئی، خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی، خلافت میں نیابتِ سالت کا تصور ختم ہو گیا، بیت المال ذاتی ملکیت سمجھے جانے لگے۔ دروازوں پر دربان مقرر ہو گئے اور خلافت دین و دنیا کی اصلاح کا ادارہ نہیں بلکہ صرف دنیا داری کی ایک بگڑھی ہوئی شکل اختیار کر گیا، مسلمانوں کا دین دار طبقہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ اب حکومت کی ملازمت یا اس کے ساتھ تعاون دین کی خدمت نہیں رہی۔ ایسے لوگوں کے لیے حکومت سے سوائے قطع تعلق کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا

نظام حکومت بہترین قسم کے متقی اور جامع صفات شخصیتوں سے مکروم ہو گیا۔ ان مایوس کن حالات میں ردِ عمل کے طور پر یہ تحریک شروع ہوئی مگر خیال یہ ہے کہ یہ تحریک صرف اور صرف اسلامی نظام اخلاق و عبادات کے تحفظ کے لیے اٹھی۔ یہ نہ تو کسی عجمی سازش کا نتیجہ تھی اور نہ ہی دوسری اقوام کے افکار سے تاثر کا حاصل، اسلامی تصوف کی ساری اصطلاحات قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں، مثلاً توبہ، صبر، توکل، رجا، خوف، تقویٰ، فقر، محاسبہ، تزکیہ، اخلاص، امانت، خشیت۔ ہمیں دلراشکوہ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ تصوف اسلام سے بہت پہلے انسانی فکر میں آچکا تھا اور انڈسٹری میں اس کی مستند تصریحات ملتی ہیں، لیکن اسے اُس تصوف سے کیا واسطہ ہے جس کے داعی اپنے تمام معتقدات و معمولات کی بنیاد صرف قرآن کو ٹھہراتے ہیں۔

گروہ صوفیاء کے سید الطائفہ جنید بغدادی فرماتے ہیں:

”اِس رَاہِ کِسے یَا بَد کہ کِتَابِ بَرِ دَسْتِ رَاسْتِ گِرَفْتَه بَاشَد و سُنَّتِ مِصْطَفَا

صَلٰی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ بَرِ دَسْتِ چَپِ و دَرِ رُوشَنٰنِی اِس دُشْمَعِ رُوہِ،

تَا نَدِ و رِ مَنَکَ شَبِہْتِ اِفْتَدِنِ و رِ ظَلَمْتِ بَدْعَتِ۔“

یہ راہ تو صرف وہی پاسکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں قرآن اور بائیں ہاتھ میں سنت رسول ہو اور وہ ان دو چپراغوں کی روشنی میں راستہ طے کرے تاکہ نہ شبہ کے گڑبھوں میں گرے نہ بدعت کی تاریکی میں پھنسے۔

شیخ ابو بکر طمسانی فرماتے ہیں:

الطریق واضح والکتاب والسنت قائم بین اظہرنا

۱۔ تذکرۃ الاولیاء : ۱۸

۲۔ رسالہ شیریہ : ۲۲



راستہ واضح ہے اور کتاب و سنت ہمارے سامنے ہے۔  
 حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں :  
 (مشرب پیر) ... حجت نئی شود دلیل از کتاب و حدیث سے باید  
 (پیر کامسک) حجت نہیں ہے دلیل کتاب و سنت سے ہوتی چاہیے،  
 حضرت سید علی جویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،  
 رکن اول از شریعت کتاب است چنانکہ گفت عرمن قال فیہ  
 آیات محکمات هن ام الکتاب، و دیگر سنت است چنانکہ گفت  
 وما اتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فاتہوا  
 و سلوہم اجماع امت چنانکہ رسول علیہ السلام گفت لا تجتمع امتی  
 علی الضلالۃ علیکم بالسواد الاعظم،

شریعت کا پہلا رکن کتاب اللہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، قرآن میں آیات  
 حکمات ہیں، جو اصل کتاب ہیں۔ دوسرا رکن سنت ہے جیسا کہ فرمایا، جو کچھ تمہیں رسول  
 عطا فرمائیں اس پر عمل کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ، اور تیسرا رکن اجماع  
 امت ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری امت گمراہی پر جمع نہیں  
 ہوتی، بڑے گروہ کا ساتھ پکڑو۔

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی فرماتے ہیں :  
 اے برادر تفاوت مراتب فقرا اگر امروز خواہی کہ دریا پی بجانب شریعت او  
 نگاہ کن کہ شریعت معیار است

۱۰ اخبار الاخیار ، ۲۵

۱۱ مکتوبات کلین مکتوب نمبر ، ۹۵

اے بھائی اگر تم فقرا کے مدارج دیکھنا چاہتے ہو تو شریعت پر ان کے عمل سے ان کا اندازہ لگاؤ، کیونکہ اس بارے میں معیار شریعت ہی ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

پیر چنان باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد و چوں  
این چنین باشد او خود هیچ نامشروع نہ فرماید؛

پیر ایسا ہونا چاہیے جو شریعت، طریقت اور حقیقت کے احکام کا عالم ہو، اگر وہ ایسا ہوگا تو خود کسی نامہائز ہر کے بارے میں نہیں کہے گا۔

ابوالحسین نورانی تصوف کی تعریف میں فرماتے ہیں:

التصوف ترك كل حظ  
للمفسد  
تصوف حظ نفس چھوڑنے کا نام ہے۔

ابوعلی قزوینی فرماتے ہیں:

التصوف هو الاخلاق المرضية  
تصوف پسندیدہ اخلاق کا نام ہے۔

ابوسہل الصعلوی فرماتے ہیں:

الاعراض عن الاعتراض  
تصوف اعتراض سے بچنے کا نام ہے۔

ابومحمد الجربری فرماتے ہیں:

التصوف الدخول في كل  
تصوف ہر نیک خصلت سے مزین

خلق سني و الخروج من

ہونا اور تمام بُری عادتوں سے چھٹکارا

كل خلق دنی سے

حاصل کرنے کا نام ہے۔

۱۳۸ رسالہ کشمیریہ

۱۴۷ ذوالفقار

۱۴۶ رسالہ کشمیریہ

۱۴۷ کشف المحجوب باب سوم فی تصوف

عمر بن عثمان المکی سے تصوف کے متعلق پوچھا گیا آپ نے فرمایا :  
 ان یكون العبد في كل صوفي بهر وقت حبس کا ہوتا ہے اس  
 وقت بما هو اذنی بہ فی کا ہو کر رہتا ہے۔  
 الوقت لہ

ان اکابرین صوفیا کی تہریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف تزکیہ نفس اور تصفیہ  
 اخلاق ہی کا نام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی بعثت کا مقصد یہی بیان  
 فرمایا ہے :

بعثت لا تتم مکارم الاخلاق  
 قرآن مجید میں منصب رسالت کے فرائض کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ :  
 ویزکیہم ویعلم الکتاب والحکمة

جس طرح ہم نے شروع میں عرض کیا ہے کوئی تحریک کتنی اچھی کیوں نہ ہو بہ تمام و کمال وقت  
 کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ بلاشبہ یہی حال تصوف کا بھی ہوا۔ شریعت و طریقت کی تفریق  
 دنیا سے فرار اور گریز اور مجاز پرستی کے ذریعے کئی خرافات اس میں گھس آئیں، اس کا  
 نتیجہ یہ نکلا کہ خود مسلمانوں میں سے بعض حضرات نے انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ تصوف  
 کو اسلام کے خلاف ایک سازش کا عنوان دے دیا۔ بعض دوسروں نے تقسیم شروع کر دی  
 کہ تصوف کی اتنی قسمیں ہیں، ایک یہ ہے، ایک یہ ہے اور ایک یہ ہے، یہ اس طرح ہے  
 جیسے کوئی شخص بد عمل مسلمانوں کو دیکھ کر یا مسلمانوں کی تیسرے درجے کی غیر ثقہ کتابیں پڑھ  
 کر اسلام کی تقسیم شروع کر دے۔ اگر یہ تقسیم درست مان لی جائے تو پھر یہ صرف تصوف ہی  
 تک کیوں محدود ہے۔ دور ملوکیت میں مدون ہونے والے بعض فقہی فتاویٰ اور یونانی

علوم کی مدافعت میں مرتب شدہ علم کلام کیوں اس کی ذیل میں نہیں آتے، سیدھی بات ہے کہ تصوف اسلامی میں جہاں جہاں خرافات گھس آئی ہیں انہیں کسی بھی صورت میں تصوف کا نام نہیں دیا جاسکتا، ایسی باتوں کا تصوف سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ خود اکابر صوفیانے اپنے اپنے دور میں ان بُرائیوں کے خلاف ہمیشہ ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔ آخری دور میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ کی مساعی اسی نوعیت کی ہیں۔

اسی وقت یہ نظریہ اتنی عمومییت اختیار کر گیا ہے کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسلامی تصوف ایرانیوں سے ماخوذ ہے یا پھر یونانیوں سے۔ دس سال یہ براڈن اور نکلسن کا نظریہ ہے، جو انہوں نے اسلامی تصوف کے اصل ماخذ سے لاعلمی کی بنا پر قائم کیا اور آگے فیشن کے طور پر چل نکلا، حالانکہ مستشرقین میں سے بعض حضرات کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ تصوف نے ہر آڑے وقت میں اسلام کی سپر کا کام دیا ہے۔ مشہور ہے مستشرق پروفیسر ایچ اے آر گب (H.A.R. Gibb) نے ایک دفعہ اپنی تقریر میں کہا تھا:

تاریخ اسلام میں بار بار ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا ہے لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیا کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا، اور اس کو اتنی قوت و توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

عبادت الہی ایک فریضے کے طور پر ادا کرنا مستحق علیہ مسئلہ ہے لیکن اس میں دل کشی، جاذبیت، محبت اور ایک خاص کیفیت پیدا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک

بندے کو اپنے خالق کے ساتھ تعلق اور اس کی کیفیات سے پُورے طور پر آگاہی نہ ہو، اسی کیفیت کو ہم محبت خداوندی یا قرب ذاتی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید کی ان آیات پر غور کیجئے،

وہو معکم ایما کنتم  
اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں  
تم ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

ولا تستخفون من اللہ وهو  
معوذ  
اور نہیں شرماتے اللہ سے اور وہ اُن  
کے ساتھ ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

واذا سالک عبادی عني فاني  
قريب  
اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے  
مجھ کو سو میں تو قریب ہوں۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:

نحن اقرب الیہ من جبل الودید  
ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے  
بھی زیادہ قریب ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

فایما تولوا فثم وجہ  
اللہ  
جو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی  
متوجہ ہے اللہ۔

آیہ ق : ۱۶

آیہ البقرہ : ۱۱۵

آیہ الحجید : ۲

آیہ النساء : ۱۰۸

آیہ البقرہ : ۱۸۶

یہ چند آیات ہم نے بطور نمونہ پیش کی ہیں۔ ورنہ قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر خدا اور بندے کے تعلق، اس کی لطیف کیفیات، اس کے آداب اور تقاضوں کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف کا اصل موضوع ہی خدا اور بندے کا تعلق ہے۔ اگر بندہ اپنے مالک حقیقی کے ساتھ اپنے تعلق کی کیفیات کا صحیح ادراک حاصل کر لیتا ہے تو زندگی کے باقی سارے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اس تعلق کے ادراک کے نتیجے میں بندے کو ہر وقت مالک کی خوشنودی اور رضا مندی کا سودا سر میں سما یا رہتا ہے اسے قدم قدم پر اس نازک تعلق کی باریکی کا احساس دامن گیر رہتا ہے اس کا چینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، بولنا، خاموش رہنا، سب کچھ اسی ایک ذات کے لیے ہو جاتا ہے۔ غور فرمائیے کہ کس قدر آفاقی اور عظیم نظریہ ہے اور اس کے دامن میں کائنات اپنی وسعتوں کے باوجود کتنی حقیر نظر آتی ہے۔ اسی مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

قل ان صلاتی و نسکی  
ومحیای و مماتی لله  
دب العلمین له  
کہہ دو میری نماز، میری قربانی، میری  
زندگی اور میری موت سب اسی  
پروردگار عالم کے لیے ہے۔

اور اسی نظریے کو شیخ فرید الدین عطار نے اس طرح ادا فرمایا ہے:

خواہم کہ ہمیشہ در ہواٹے تو زیم  
مقصود من بندہ ز کونین توئی  
خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم  
از بہر تو میرم و برائے تو زیم

صوفیائے محبت الہی کو بنیاد اور قرب و معیت ذاتی کو منزل قرار دے کر فکر و عمل میں جو انقلاب پیدا کیا، تاریخ عالم میں پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس طرح وہ دکھ

کو عطیہ محبوب، ابتلا و آزمائش کو امتحان، مہو کو کو طعام دوست اور رنج و کلفت کو راہ عشق کے گانے سمجھ کر زندگی کی تلخیوں، ناکامیوں اور ناہمواریوں کو خوشگواہی، مسرت اور زیادہ بہتر اور قابل عمل طریقے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ تصوف فرار اور گریز ہے مگر عبور جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ تصوف کا سارا رخ ہی انسان کی طرف ہے وہ مظلوم کی حمایت، ظالم کو ہدایت، سرکش اور مغرور لوگوں کو خادم انسانیت بنانے کی دعوت، خدا ترسی، ہمدردی، غم گساری اور رضا کارانہ خدمت کو عبادت کا درجہ دینے کا دعویٰ کرتا ہے۔ تصوف نے عبادات میں جو لذت، حلاوت اور پچاشنی پیدا کی ہے اس نے خود زندگی میں مقصدیت اور حسن پیدا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکومتوں کے عروج و زوال کی حیرت ناک داستانیں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں۔ ایک صوفی خدا سے بول لگائے، من کی دنیا آہا دیکھے اپنے کام سے کام کھتا ہے۔ اگر صوفیاء کا حسن عمل اور اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی کا نصب العین مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ نہ ہوتا تو مسلمان برصغیر ایسے دور دلازمہ ملک میں سے اقتدار کے قاتمے کے بعد اسپین کی طرح کب کا اپنا بستر بویا لپیٹ چکے ہوتے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو ایک آفاقی پیغام کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس پیغام کا سارا پر و گرام عدل، انصاف، مساوات اور دنیا کے انسانیت کے لیے ایک فلاحی معاشرے کے قیام پر مبنی تھا، خلافت راشدہ کے بعد اس پر و گرام کی قیادت و سیادت میں صوفیاء کے طرز عمل میں ملتی ہے۔ انہوں نے انسانیت کو الخلق عیال اللہ قرار دے کر بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و ملت، خدمت کو اپنا شعار قرار دیا، دور دراز ممالک میں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں انہوں نے جس حکیمانہ ذرف نگاہی اور فدا اندیشی سے کام لیا وہ انہی کا حصہ ہے انہوں نے ہر ملک و قوم کی مخصوص سماجی و ثقافتی روایات سے براہ راست تصادم اور ٹکرائی بجائے خود ان سے تبلیغ کا کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ

انہیں اس سلسلے میں بعض اوقات مجبوراً بعض نسبتاً غیر اولیٰ طریقے بھی اختیار کرنا پڑے۔ چونکہ ان کی پشت پر کوئی سیاسی قوت موجود نہیں تھی۔ اس لیے وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ اسی طرح برصغیر ایسے ممالک میں ہم آج ایک زندہ سیاسی قوت کے طور پر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں موجود ہیں کہ ہمارا آئندہ لائحہ عمل اور سیاسی دہلی پروگرام کس طرح تشکیل پائے۔ ہمیں حیرت ہے کہ ہمارے وہ رہنما جو صوفیاء کے طرز تبلیغ پر سیدہ نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں، یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر بقول آپ کے صوفیاء کی یہ اپنا ج تبلیغ بھی نہ ہوتی تو برصغیر میں آپ کی پوزیشن کیا ہوتی؟ اور کیا کسی فیصلہ کن گفتگو کے آپ اہل ہوتے؟ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ تصوف کے راستے سے کچھ خرابیاں و آئیں مگر یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اتنی پرانی اور عظیم تحریک کے لیے ایسی باتیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں بالخصوص اس وقت جبکہ ہمارے پاس اس تحریک کے اصول و فروع پر مشتمل اساطین صوفیاء کی مٹن کردہ اہمات کتب موجود ہیں۔ میں کہتا ہوں اسلامی تصوف کے برس ہا برس بعد شیخ محمد بن الوہاب نجدی کی زیر قیادت بظاہر جو اصلاحی تحریک اٹھی چند ہی برسوں میں اس کا نتیجہ کیا نکلا، یہی ناکہ اس کے داعیوں نے اس جہذب وہ میں دنیا کے نقشے پر ایک جدید ملوکیت نما شہنشاہیت کی بنیاد رکھ دی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تصوف کے دستور العمل یا نصاب کے بارے میں مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔

تصوف میں بیعت کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے اور یہ کتاب و سنت سے

ثابت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

ان الذین بیایعونک  
انما یبایعون اللہ لہ

تحقیق جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے  
وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔



دوسری جگہ فرمایا:

لقد رضى الله عن  
المؤمنين اذ يباعدونك  
تحت الشجرة لـ  
تحقيق الله خوش ہوا ایمان والوں سے  
جب بیعت کرنے لگے آپ سے اس  
درخت کے نیچے۔

تصوف میں دوسری اہم بات مرشد کی صحبت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تزکیہ و نفس  
نفوس کے لیے صرف کتابیں کافی ہوتیں تو انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری نہ کیا جاتا  
جس طرح آج بعض علوم صرف پڑھنے سے نہیں آتے بلکہ لازماً ان کی پریکٹیکل کرنا پڑتی ہے  
اسی طرح تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ایسا آسان کھیل نہیں کہ آپ حب اور جس وقت  
چاہیں کسی کو محض کتابوں سے متقی، خداترس، دیانت دار اور خدمت گزار بنا دیں،  
اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر دور میں ایسے خاصانِ خدا رہیں جو فکر و عمل کی پاکیزگی  
سے لوگوں کی تقدیریں بدلتے رہیں۔

تصوف میں تیسری بات خلوت گزینی ہے اس کی بنیاد غار حرا میں آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کی وہ گوشہ گیری ہے جس میں آپ نے آثارِ قدرت پر غور و خوض اور عرفانِ ذات  
کا مجاہدہ فرمایا، جس وقت طبیعت میں حقائق کا ادراک جاگزیں ہو جائے پھر لوگوں سے  
اختلاط نقصان نہیں دیتا لیکن عرفانِ نفس اور دل کو مجتبیٰ و مصفا کیے بغیر لوگوں سے  
میل جول کئی بیماریوں کو جنم دے سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تعلیم  
کی خاطر ایسا عمل فرمایا۔

تصوف کی ایک بنیادی تعلیم محبتِ خداوندی ہے، یعنی اس کو چہرے میں قدم رکھنے  
والے ہر باہمی کی منزل اور مقصد وصالِ خداوندی ہے، وہ اسی دھن اور نرطپ میں ہر

لے الفتح ۱

marfat.com

تکلیف کو راحت ہر خار کو پھول اور ہر مصیبت کو رحمت سمجھ کر آگے بڑھتا رہتا ہے، اس کے تمام مجاہدات، ریاضتیں، عبادات راستے کی وہ ضروری منزلیں ہیں جنہیں دیدارِ یار کی خاطر ہنس ہنس کر طے کرنا پڑتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

والذین امنوا اشد اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، وہ اللہ  
حب اللہ ۱۰ کی محبت میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔

اس راہ میں مجاہدے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مجاہدہ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے محبوب حقیقی کی آرزو میں جہدِ مسلسل کی جائے اور اس باب میں کسی بات کی پرواہ نہ کی جائے، ارشاد ہوتا ہے:

والذین جاہدوا اور جنہوں نے محنت (مجاہدہ) کی  
فینا لنهدینہم ہمارے واسطے ہم سجادیں گے  
سبلنا ۱۱ ان کو اپنی راہیں۔

تصروف کا ایک مہتمم بالشان فریضہ عبادات اور ذکر و فکر میں مشغول و مصروف رہنا ہے اس سے بے چین دلوں کو سکون اور غافل روجوں کو آگہی نصیب ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

واذکروا لله کثیرا اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم مراد  
لعلکم تفلحون ۱۲ پا جاؤ۔

۱۰ البقرہ : ۱۷۵

۱۱ العنکبوت : ۴۹

۱۲ الانفال : ۴۵

دوسری جگہ ارشاد ہے:

الذین یذکرون اللہ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے  
قیماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم اور بیٹھے اور کھڑے پر لیٹے اور  
ویتفکرون فی خلق فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی  
السموات والارض لہ پیدائش میں۔

آپ غور فرمائیے ان میں وہ کونسی ایسی بات ہے جو خود قرآن اور حامل قرآن  
صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت یا عمل نہیں ہے اس وقت ہمارے نامور صوفیاء کی  
گراں قدر تصانیف موجود ہیں۔ دعوت سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تصوف کی  
ان مایہ ناز بنیادی کتابوں میں کوئی ایک ایسی بات دکھائی جائے جو قرآن و سنت کے  
خلاف یا اس سے متصادم ہو، اسلامی تصوف کی بنیادی کتابیں یہ ہیں:

اللمح فی التصوف از ابو نصر سراج م ۳۸۶ھ، التعرف لمذہب اہل التصوف  
از ابو بکر کلابازی م ۴۳۳ھ، قوت القلوب از ابو طالب المکی م ۳۸۷ھ، طبقات الصوفیہ  
از ابو عبد الرحمن اسلمی م ۴۱۲ھ، حلیۃ الاولیاء از ابو نعیم م ۴۳۳ھ، الرسالة القشیریہ از امام  
قشیری م ۴۶۵ھ کشف المحجوب از علی بن عثمان ہجویری م ۴۶۵ھ طبقات الصوفیہ از عبد اللہ  
ہرودی م ۴۸۸ھ، فتوح الغیب از شیخ عبدالقادر جیلانی م ۵۶۱ھ، تذکرۃ الاولیاء از  
فرید الدین عطار م ۶۳۳ھ عوارف المعارف از شیخ شہاب الدین سہروردی م ۶۳۲ھ،  
الفتوحات المکیہ از شیخ محی الدین ابن عربی م ۶۳۸ھ، نفحات الانس از نور الدین جامی م ۸۹۰ھ  
طبقات الکبریٰ از شیخ عبد الوہاب شعرانی م ۹۶۳ھ۔ اور اگر یہ کتابیں اول تا آخر  
کتاب و سنت کی عمل کی دعوت دیتی ہیں، اپنی ہر بات کی سند قرآن اور سیرت محمدیہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے فراہم کرتی ہیں تو پھر تصوف کے بارے میں ہمیں در آمد شدہ نظر پاتا  
تبدیل کرنا ہوں گے۔

اس وقت پوری دنیا شدید مسائل سے دوچار ہے ان میں سے دو مسئلے ایسے  
ہیں جن کا تعلق دنیا کی بقا سے ہے، یہ مسائل ہیں بھوک اور افلاس سے نجات اور خطرناک  
ایٹمی جنگ سے تحفظ، ہمارے نزدیک ان مسائل کے حل کی کوئی صورت سوائے اس  
کے نظر نہیں آتی کہ اقوام عالم صدق دل سے نظریہ الخلق عیال اللہ رساری دنیا اللہ کا  
کنبہ ہے، پر کار بند ہوں، یہی وہ آفاقی نظریہ ہے جس میں چھینا چھپٹی، ہوس ملک گیری  
کشت و خون اور کمزور کے حقوق غصب کرنے کا جذبہ، کسی قید میں مقید ہو سکتا ہے یہی  
وہ مقام ہے جہاں انسان ہر مخلوق کی تکلیف کو اپنے پہلو کا درد محسوس کرتا ہے۔ حضرت  
خواجہ نظام الدین محبوب الہی سے کسی نے عرض کیا حضور! لوگ آپ کے بارے میں کہتے  
ہیں کہ شیخ نظام الدین کو بڑا فروغ باطنی حاصل ہے انہیں اس جہان کا کوئی فکری نہیں  
آپ نے فرمایا:

این قدر غم و اندوہ کہ مرا ہست پیچ کس را دریں جہاں نیست زیرا کہ چندین خلق  
مے آند و غم و اندوہ خویش مے گویند اک ہمہ بر دل و جان من نشیند عجب ہے باشد  
کہ غم برادر مسلمان بشنوند و دروے اثر نکند۔

جس قدر غم و اندوہ مجھے رہتا ہے اس جہاں میں کسی کو نہ ہو گا میرے پاس اتنی مخلوق  
آتی ہے ہر شخص اپنا دکھ اسنا تا ہے اس کا بوجھ میری جان و دل پر پڑتا ہے وہ عجب دل ہے  
کہ مسلمان مجھائی کا غم سنے اور اس پر اس کا اثر نہ ہو۔  
غالباً اسی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

خنجر کسی پہ چلے تڑپتے ہیں ہم اسیر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

شیخ سعدی نے زیادہ بہتر انداز میں اس کی توضیح کی ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار وگر عضو ہارا منسا ند قرار

حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ آپ ذر سے لکھنے کے قابل ہیں:

یہ بے خار نہد و تو ہم خار نہی این خار خار باشد..... میان مرد ماں ہم چنین

است کہ بانغز اں نغز ای با کوزاں کوزی اما میان درویشاں ہم چنین نیست

کہ بانغز اں نغز ملی با کوزاں ہم نغز ملی۔

اگر کوئی کاسٹار رکھے اور تو بھی اس کے بدلے میں کاسٹار رکھے تو کاسٹے ہی کاسٹے

ہو جائیں گے۔ عام لوگوں کا دستور تو یہ ہے کہ اچھے کے ساتھ اچھے اور بُرے کے بدلے

بُرے ہوتے ہیں مگر درویشوں کا دستور یہ نہیں ہے، یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ

نیک ہونا چاہیے۔

آپ کی زبان پر اکثر یہ شعر جاری رہتا:

ہر کہ مارا رنجہ دا در احتش بسیار باد ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد

ہر کہ خارے افگند دریاہ ما از دشمنی ہر گلے کز باغ عمرش بشگند بے خار باد

اسی طرح تمام اکابر صوفیا عملی طور پر سخی ملکیت کے مخالف رہے ہیں، ان کے ہاں

زہد اور توکل کا ثمرہ ہی یہی ہے کہ بچا کر کچھ نہ رکھا جائے، جمع نہ کیا جائے، اور لوگوں سے

کسی قسم کی امید نہ رکھی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طرز عمل بھی

تقریباً یہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث میں کوئی درہم، دینار، بھیر بکری، نہیں چھوڑی جو معمولی چیزیں چھوڑیں ان کے بارے میں بھی فرمادیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے۔ تمام اکابر صوفیا اسی اصول پر سختی سے کار بند رہے ہیں۔ انہوں نے اجتماعی معاشرے کی بنیاد رکھی۔ خانقاہوں میں اشتراکِ عمل کا نظام چلتا تھا جہاں شیخ بھی مریدین کے ساتھ روکھی سوکھی پر گزارا کرتا۔

صوفیاء کی تاریخ اس جلبِ زر کے دور میں ہمارے پاس روشنی کا بلند مینار ہے جس نے ہمارے سرخسر سے بلند کر دیئے ہیں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ان بزرگوں نے جان کی بازی لگا کر اسلام کی روح کو زندہ رکھا ٹھیک اسی طرح انہوں نے معاشی اور معاشرتی میدان میں بھی ہمارے لیے وہ ڈھانچے جوں کاتوں محفوظ رکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا، لاکھوں کی یافت اور فتوحات ان کے معمولات پر اثر انداز نہ ہو سکے، سادگی، قناعت، دنیا سے نفرت، اور خدمتِ خلق میں انہوں نے عمریں گزار دیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اکثر روزہ سے ہوتے۔ بعض اوقات سحری کے وقت خواجہ عبدالرحیم (خادم) کھانا لے جاتے اور عرض کرتے حضور! آپ نے افطار کے وقت بہت ہی کم کھانا تناول فرمایا تھا اگر سحری کے وقت تھوڑا تناول نہ فرمائیں گے تو ضعف بڑھ جائیگا اس پر آپ زار و قطار رونے لگتے اور فرماتے:

چندیں سکیناں و درویشاں در کنج ہائے مساجد و دوکانہاگر سزد  
فاقد زده افتادہ اند این طعام در حلق چگونہ فرورد۔

۱۰ تاریخ مشائخ چشت جناب خلیق احمد نظامی : ۵۴

کتنے مسکین اور درویش مساجد کے کونوں اور بازوؤں میں بھوکے پڑے ہوئے ہیں۔ بھلا یہ کھانا میرے حلق سے کیونکر اتر سکتا ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ملکیت کے دور میں مدون ہونے والے ذخیرے بھی آزاد مسلم معاشرے کی بنیاد بننے کی اتنی صلاحیت نہیں رکھتے جتنی ہر دور میں ان سے نکلنے والے مردانِ خدا کی پاکیزہ اور بھرپور زندگیوں کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ہمارے لیے اس جدید دور میں یہی وہ سرمایہ ہے جسے ہم اقوامِ عالم کے سامنے بطور چیلنج کے پیش کر سکتے ہیں اگر صوفیا کی اس جدوجہد اور تحریک کو نہ مانیں تو پھر ہمارا تاریخی تسلسل باقی نہیں رہتا۔ کیا اسلام واقعی اس میں برسِ رسالت (راشدہ) کے بعد ختم ہو گیا، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تاریخ اسلام کی نمائندگی کا تاج بنو امیہ کی حکومتوں کے سر پر رکھے گی یا بنو عباس کی حکومتوں کے سر پر، تحریکیں خلا میں زندہ نہیں رہیں، ان کا واسطہ محسوسات اور حقائق سے ہوتا ہے۔ کیا ہوا اگر خلافتِ راشدہ کے خاتمے کی صورت میں سیاست اسلام کی ترجمان نہ رہی، یہ کوئی کم فضیلت کی بات ہے کہ اس کی معیشت و معاشرت اور اخلاق و تمدن پوری قوت اور آب و تاب سے بڑھتا رہا اور اس کے لیے گڈی پوش فقراء کی ایک بے سروسامان جماعت نے وہ کام کر دکھایا جو ایسی تحریکوں سے بھی نہ ہو سکا جن کی پشت پر مضبوط سیاسی اقتدار موجود تھا۔

صوفیاء کے کارناموں کو سمجھنے کے لیے پوری مسلم تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے تاہم مختصر الفاظ میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے انتہائی جامع انداز میں انہیں اس طرح بیان کیا ہے،

- ۱۔ اسلام کی جو پاکیزہ تعلیمات کتابوں میں درج ہیں اور مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں صوفیاء نے اپنی خانقاہوں میں ان پر عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا۔

- ۲۔ صوفیاء نے ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو زندہ رکھا۔

- ۳۔ صوفیاء سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیر سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا۔

- ۴ - صوفیائے بادشاہوں کے سامنے علی الاعلان کلمہ حق کہا۔
- ۵ - جب مسلمانوں میں عقلیت کا مذاق پیدا ہونے لگا اور انہوں نے قرآن کو اپنی عقل کے تابع بنانا شروع کیا تو صوفیائے محبت الہی کا درس دے کر عقلیت کے مُضر نتائج کا انا لہ کیا۔
- ۶ - جب فقہانے دین کے ظواہر پر زور دیا تو صوفیائے باطنی اصلاح اور قلبی طہارت کا درس دے کر قوم کو اعتدال کی راہ دکھائی۔
- ۷ - صوفیائے ہر دور میں غیر اسلامی عقائد شرک اور بدعت کی تردید کی۔
- ۸ - سرمایہ داری کے مقابلے میں انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت واضح کی۔
- ۹ - بادشاہوں کو دینداری کی تلقین کی۔
- ۱۰ - جب معتزلہ، فقہاء اور متکلمین منطقی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اور امت کو فرقوں میں منقسم کر رہے تھے، اس وقت صوفیائے مسلمانوں کو توحید اور یک نگاہی کا درس دیا۔
- ۱۱ - جب فقہاء مسلمانوں کو آپس میں لڑا رہے تھے اس نازک دور میں صوفیائے ان کو محبت اور سہرہمی کا درس دیا۔
- ۱۲ - فقہاء اور متکلمین نے دفتوے دے کر مسلمانوں کو کافر بنا دیا مگر صوفیائے کرام نے اپنی زندگی کے ذریعے کافروں کو مسلمان بنایا۔
- ۱۳ - فقہاء، متکلمین اور معتزلہ نے مختلف مذہبی گروہ بنا کر مسلمانوں کے شیرازہ ملی کو منتشر کر دیا مگر صوفیائے سب مسلمانوں کو جام وحدت پلایا۔
- ۱۴ - علماء اور فقہاء بادشاہوں کا قرب حاصل کرتے رہے مگر صوفیاء دربار شاہی سے الگ تھلک رہ کر ملوکیت کے مفاسد بیان کرتے رہے۔
- ۱۵ - جب علماء بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے تاویلات میں مشغول تھے اس وقت



صوفیاء و شاہوں کو خوفِ خدا کا درس دیتے رہے۔

۱۶- معتزلہ، متکلمین اور حکماء نے اپنا وقت ذات و صفات کی بحثوں میں ضائع کیا، صوفیوں نے کہا کہ خدا کے بارے میں بحث فضول ہے۔ خدا منطق کے ذریعہ نہیں مل سکتا۔ آئینۂ قلب کو صاف کر دنا کہ اس کا دیدار ہو سکے۔

۱۷- علماء نے دینی کتابیں لکھیں صوفیوں نے وہ آدمی تیار کئے جنہوں نے ان کتابوں کے احکام پر عمل کر کے انقلاب برپا کر دیا۔

۱۸- علماء و متکلمین، معتزلہ، حکماء، نے صرف دماغ کی آبیاری کی صوفیوں نے دماغ کے

ساتھ ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیا اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ اسلام میں اصلی چیز دل ہے نہ کہ دماغ، اگر دل فاسد ہو جائے تو دماغ کا فائدہ ہو جاتا یعنی ہے چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "آگاہ ہو جاؤ انسان کے جسم میں ایک عضو ہے اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جائیگا اور اگر وہ صالح ہو جائے تو سارا جسم صالح ہو جائے گا اور وہ عضو قلب ہے۔"

۱۹- علماء نے مسلمانوں میں گروہ بندی کی صوفیوں نے انسانوں کو الخلقِ عیال اللہ کا درس دیا۔

۲۰- علماء نے دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا صوفیاء نے مشاہدہ باطنی کے

ذریعے سے اسلام کی صداقت واضح کی۔ لوگوں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کہ

بشرِ حافی تو عالم دین نہیں ہیں پھر آپ ان کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ انہوں نے

فرمایا کہ میں کتاب اللہ سے آگاہ ہوں مگر بشرِ حافی اللہ سے واقف ہیں اس

لیے ان کا مرتبہ میرے مرتبے سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔

۱۴۲۰ھ تا ۱۴۲۱ھ : تاریخ تصوف از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

## رُوحِ تَصَوُّف

میں سید خورشید احمد صاحب گیلانی کی کتاب 'روحِ تصوف' پر ابتدائی کلمات لکھتے ہوئے اپنے اندر خوشی و مسرت کی عجیب کیفیت محسوس کر رہا ہوں گیلانی صاحب ایک ایسے نوجوان فاضل ہیں جنہیں قدرت نے زبان و قلم کی بے شمار خوبیاں عطا فرمائی ہیں، ان سے اپنے پرانے روابط کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی موضوعات سے متعلق شاید ہی کوئی لائق اعتنا ایسی چیز ہو، جو ان کے مطالعے سے روگنی ہو۔ گیلانی صاحب پر بھی ایک ایسا زمانہ گزر چکا ہے جو ہر ذہن اور حساس ذہن پر گزرتا ہے۔ مطالعے کی فراوانی، متضاد اور باہم دگر متضادم نظریات کے تقابلی جاننے کے ساتھ اگر قدرت نے نقاد ذہن بھی عطا کیا ہو تو ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں ذہن ہر چیز سے باغی ہونے لگتا ہے۔ غالباً یہی وہ مقام ہے جس کی طرف 'العلم حجاب الاکبر' کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جس دماغ پر یہ کیفیت نہیں گزری وہ اسلام کے آفاقی پیغام اس کی رفعتوں اور لطافتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مجھے فخر ہے کہ اس عبوری دور میں میں نے جناب گیلانی صاحب کو صوفیا کے آفاقی پیغامِ محبت اور پیامِ رحمت و رافت کے مطالعے کی دعوت دی اور ان گزارش کی کہ مروجہ رسوم و رواج اور تنقیدی مواد کے بجائے اصل کتابوں کو دیکھا جائے۔ حسن اتفاق سے اس دوران میں انہیں حضرت قبلہ حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ ایسے حقیقی صوفی سے بھی تعارف حاصل ہو گیا، میری درخواست اور قبلہ حکیم صاحب کی صحبت بالآخر انہیں اس وادی میں کھینچ لائی جہاں عزالی جیسے ائمہ فلسفہ بھی اپنا سب کچھ پار بیٹھے۔

جناب گیلانی صاحب مطالعے کے رسیا ہیں ان کے پاس وسیع ذاتی کتب خانہ

موجود ہے ان کا ماحول علمی ہے اور قدرت نے انہیں کام کرنے کا سلیقہ بخشا ہے۔ ان کی زیر نظر کتاب 'روح تصوف' پڑھ کر ان کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، اس مادی دور میں ہر چیز کو سطحیت سے دیکھنے کی خوگر دینا کو انہوں نے انتہائی موثر انداز میں دعوت دی ہے کہ وہ اسلامی تصوف کو بغور پڑھے۔ کتاب کا انداز بیان انتہائی شگفتہ، زبانی سلیس اور آورد کے مقابلے میں آند ہے۔ عالمانہ مسائل اور پیچیدہ فنی بحثوں سے اجتناب کیا گیا ہے، سچی بات یہ ہے کہ یہ کتاب ان تمام الزامات کا صفایا کر دیتی ہے جو پچھلے کئی برس سے تصوف پر عائد کیے جا رہے ہیں۔ سیدھی بات ہے کہ خود انہی تصوف ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ تصوف کی صحیح تعریف کریں، اگر وہ اس بات پر متفق ہیں کہ تصوف 'اسلام کی روح اور قرآن کی دعوت ہے' وہ اول تا آخر قرآن اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہے تو پھر کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے صوفیا پر الزامات لگا کر توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائمہ کا مرتکب ہو۔

البتہ ایک بات بطور خاص کھٹکی اور وہ یہ کہ تصوف کی بنیادی کتابوں کے حوالہ جات کے لیے بعض دفعہ تراجم پر اکتفا کیا گیا ہے۔ گیلانی صاحب ایسے فاضل انسان کے لیے جو براہ راست اصل ماخذ سے استفادہ کر سکتا ہے، تراجم پر انحصار کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ تو یقیناً یہی ہے کہ وہ ترجمے کی ذمہ داری کا بوجھ بھی اپنے اوپر ڈالنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ ان کی ثقہ تحریریں پڑھنے والے احباب کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ترجمے پر اعتماد نہ کریں۔ لیکن اگر وہ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو ضروری تھا کہ وہ اصل عبارات دینے کے بعد تراجم کے سلسلے میں ذمہ داری کا بوجھ دوسروں پر ٹالتے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے تراجم کے حوالے بھی موجود ہیں جن کے غیر ثقہ ہونے پر ملک کے علمی حلقے متفق ہو چکے ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں یہ بھی کمی پوری کر دی جائے گی۔

مجموعی طور پر کتاب انتہائی خوبصورت، تحقیقی اور معیاری اور وقت کی ضرورت ہے۔ راقم السطور اس کتاب پر جناب سید خورشید احمد گیلانی کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔ اور توقع ہے کہ مستقبل میں وہ اپنی نگارشات سے بدستور علمی سرسلسلے میں اضافہ کرتے رہیں گے۔

سید محمد فاروق القادری ایم اے  
آستانہ عالیہ شاہ آباد شریف  
گڑھی اختیار خاں

۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ



# پیش گفار

خلافت سے ملوکیت کی طرف سفر کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں بیٹ گئی۔ سیاسی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی جن کے شب و روز اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی تدبیروں میں بسر ہوتے اور جو مسلمانوں کی گردنوں پر بھجن اس بنا پر سوار ہو گئے تھے کہ ان کے پاس قبائلی عصبیتوں، مکارانہ چالوں اور قوت و دولت کا سرمایہ وافر مقدار میں تھا۔

وہ اپنے اقتدار کی شب تاریک کو طول دینے کے لیے سب کچھ کر گزرتے کی اہمیت رکھتے تھے، دھوکہ، فریب، عیاری، مکاری، ترغیب و تمہین، ظلم و ستم اور وحشت پر برہمیت حتیٰ کہ ایمان فروشی بھی ان کے لیے فائدہ مند ہوتی تو اس سے دریغ نہ کرتے۔

دوسری طرف وہ لوگ تھے جن کا سرمایہ مسیحت خدانوخی، صبر، توکل، تقویٰ، فقر، محاسبہ، تزکیہ، اخلاص، امانت، دیانت اور اعلام کلمۃ اللہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور انسانوں کی خدمت ان کی زندگی کا مشن تھا اور وہ اس سلسلے میں کسی کمزوری اور مداہنت کا مظاہرہ نہ کرتے۔

انہیں اپنے اس مقصد سے کس قدر عشق تھا اس کی ایک مثال بت کدہ ہند کے تاریک ماحول میں روشنی پھیلانے والے بزرگوں کی وہ کوششیں ہیں جو انہوں نے ہم پرستانہ معاشرے میں ظالمانہ و جاہلانہ حکومتوں کی طرف سے رکاوٹوں کے باوجود جاری رکھیں اور جس کے

نتیجے میں یہاں کے چتے چتے پر اسلام کا نور پھیل گیا۔ ان لوگوں کی شبانہ روز محنتوں اور پاکیزہ روحانی زندگی سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ یہاں اسلام کی اشاعت کا کام اصلاً انہی بزرگوں کا کارنامہ ہے۔ فاتحین اور سلاطین تو ان کی کاشت کی ہوئی کھیتیوں سے فائدہ اٹھاتے اور تاریخ میں اپنا نام لکھواتے رہے۔

قیادت کی یہ تقسیم عمل میں آئی تو مسلمانوں کے اجتماعی شعور نے زندگی کے ٹھوس حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے بے مثال دانائی اور شاندار حکمت عملی کے ساتھ مؤخر الذکر قیادت کو اپنی اُمنگوں اور آرزوؤں کا منظر فرار دیا اور اول الذکر قیادت کے ذریعے اپنے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کو برقرار رکھا۔ یہ قیادت مملکت کا نظم و نسق چلانے اور حدود و تعزیرات کے نفاذ کا فریضہ انجام دیتی جبکہ روحانی قیادت اعمال و اخلاق کا وہ اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی جس کا مظاہرہ خلافت راشدہ کے دور میں ہوا تھا اور جسے سامنے رکھ کر مسلم امت اس کے دوبارہ قیام کے لیے ہر دور میں کوشاں رہی۔

مسلمانوں کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی قسم کی انار کی پھیلائے بغیر وہ مقاصد حاصل کر لیے جو کسی نظام کی کامیابی کے لیے ضروری سمجھے ہیں۔ انہوں نے ایک طرف تو بڑے بھلے سیاسی ڈھانچے کو برقرار رکھ کر تاریخی تسلسل مجروح نہ ہونے دیا اور دوسری طرف اس اجتماعی شعور نے قیادت کے اعلیٰ ترین معیار کا خاکہ بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ مسلمانوں کے دل صرف ان لوگوں کے آگے جھکے جن کی زندگی اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عبارت تھی اور جو قیادت کے اس اعلیٰ ترین معیار پر پورا اترتے تھے، جس کا نقشہ مسلمانوں کی آنکھوں میں رچا بسا ہوا تھا۔

یہ دوسری قسم کی قیادت جن لوگوں پر مشتمل تھی ان کے پاس نہ کوئی سلطنت ہوتی اور نہ سرکاری عہدے۔ حتیٰ کہ یہ لوگ اکثر اوقات رعایا کے عام افراد سے بھی بڑھ کر تنگ دست اور مغلوک الحال ہوتے لیکن ان کے اقدار کا دائرہ بہت وسیع تھا، انسانی دل و دماغ پر حکومت

کرنے والے یہ لوگ بیک وقت لاکھوں کروڑوں انسانوں کے مرجع عقیدت ہوتے اور بڑے بڑے فرعون صفت سلاطین و حکمران ان سے خوف محسوس کرتے۔

یہی لوگ تھے جن کی مجلسوں اور خانقاہوں میں حاضری دینے والے افزو بڑے بڑے بکلاہوں کو خاطر میں نہ لاتے اور جہاں محمود و ایاز ایک ہی صفت میں کھڑے نظر آتے۔ حضرت حسن بصریؒ، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ، حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ، حضرت معین الدین اجمیریؒ، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین دہلویؒ اور اس طرح کے دوسرے صوفیاء کرام اپنے اپنے عہد میں قیادت کے اُس منصب پر فائز نظر آتے ہیں جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں۔ یہ حضرات اُمت کی عقیدتوں اور محبتوں کا مرکز تھے اور ان کے اعمال و اخلاق لوگوں کے لیے لائق تقلید۔

اسلام کے عالمگیر پیغام سے انسانیت کو روشناس کرانے اور اسلام کی عالمگیر اور ابدی پچائیوں کو انسانی اذہان میں راسخ کرنے کے لیے جو کارنامہ ان بزرگوں نے انجام دیا اور نبوی طریقے کے مطابق کہنے سے زیادہ کر گزرنے اور بتانے سے زیادہ عملی نمونہ پیش کرنے کی جو تکنیک ان صوفیاء نے اختیار کی اس کی ایک جھلک ”روح تصوف“ میں ملتی ہے جسے عزیز محترم سید خورشید احمد گیلانی نے بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔

”روح تصوف“ جن خوبیوں کا مرقع ہے اس کا اصل اندازہ تو کتاب کے مطالعے سے ہوگا لیکن فقیر کی ناقص رائے میں:

۱) فاضل مصنف نے کمال خوبی سے فنی اصطلاحات اور نظری مباحث میں اُلجھے بغیر صوفیاء کرام کے اصل کارناموں اور ان کی تعلیمات کو سنگتہ انداز میں پیش کر دیا ہے اس سے ایک طرف توقاری کو کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات کی سہولت حاصل ہوگئی ہے اور دوسری طرف وہ کتابت بھی محسوس نہیں کرتا۔

(۲) فاضل مصنف چونکہ تصنیف و تالیف کے جدید تقاضوں سے بھی واقف ہیں اور اُن کا ذوق مطالعہ قدیم موضوعات کے علاوہ عصری مسائل و تحریکات کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے اس لیے "روح تصوف" کو انہوں نے حوالوں کا مجموعہ نہیں بننے دیا بلکہ مناسب مواقع پر تجزیے اور تبصرے کی زبان استعمال کی ہے اور ایک کامیاب تجزیہ نگار کی طرح اپنے موضوع سے انصاف کر گزرے ہیں۔

" تصوف مسائل کا حل " کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

" تصوف کا دعویٰ ہے کہ خدا سے بے خوفی نے معاشرتی مشکلات کو جنم دیا ہے۔ مثلاً جھوٹ، غداری، قتل، فساد، بد امنی، قانون شکنی، ظلم، دنیا کی رغبت نے معاشی مسائل پیدا کیے ہیں۔ مثلاً ہوسِ زرہ، ذخیرہ اندوزی، چوری باری، حبِ جاہ، سرمایہ پرستی، شکم پوری اور نفس پرستی وغیرہم۔ آج مدیرین عالم اکیڈمیاں قائم کرنے، کمیٹیاں بنانے، مجلسیں بٹھانے، اجلاس بلانے، تحقیق کرنے، فلسفے مرتب کرنے، طریق کار تجویز کرنے اور لائحہ عمل تیار کرنے کے بجائے ان دو باتوں کو اپنی روح کے ساتھ عام کر دیں تو یہ مسائل اپنی موت آپ مر جائیں۔ تصوف کی خالقانہوں نے غریبوں کو نفیس و لطیف دسترخوانوں پر بٹھایا اور امیروں کو روکھی بوٹی اور سوکھی مال سے آشنا کیا اور دونوں کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف کدورت و نفرت اور ان خود تجویز کردہ معاشی و معاشرتی بُعد کا خاتمہ کر دیا، آج وہی تصوف کیونزوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا؟ تصوف کے جن اداروں نے ہوا و ہوس کے بندوں کو ایک خدا کی بندگی پر لگا دیا۔ آج وہ وطنیت اور قومیت کے بُت نہیں توڑ سکتا اور خدا سے رشتہ نہیں جوڑ سکتا۔ "

تصوف کے اداروں کی وجہ قیام یوں بیان کی گئی ہے:



تصوف کے ادارے دراصل اس وقت وجود میں آئے جب علم، علماء کے ذہنی تعیش کا ذریعہ اور وعظ و نصیحت کے بجائے دوسرے کو نیچا دکھانے کا ہتھیار بن گیا تھا! غلط و معروف تھے مگر مفہوم و معنی سے یکسر خالی، عباد و زہاد اور ادب و وظائف میں مشغول تھے لیکن ان کی روح سے نا آشنا حکمرانی کا ڈھانچہ اسلامی کہلاتا مگر دنیا کی رغبت اور حُبِ جاہ نے قوانین کو بازیچہ اطفال اور حکومتی اداروں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ قال اقوال کی فضائیں اور حق ہو کی صدائیں نہ کسی کے ذہن کا رنگ آتاتیں اور نہ کسی کے سائڈل کے تار ہلاتیں۔ تصوف نے اگر اس روح کو بیدار کرنے پر زور دیا جو علم کو با مقصد، زہد کو نتیجہ خیز، حکومت کو خادمِ خلق اور تعلیم و تدریس کو سرگرم بناوے۔ کہا جاتا ہے کہ تخت سلطنتِ فاسقوں کے ہاتھ میں رہا مگر صوفیاء مراقبوں میں مست رہے۔ اٹھ کر ٹوکا نہیں، تحریک کیوں نہیں چلائی۔ لوگوں کو اگسایا کیوں نہیں جذبات کو بھڑکایا کس لیے نہیں؟ یہ ساری باتیں بجا مگر ان کا حاصل کیا؟ یہی ناکہ ایک ہٹا دوسرا بیٹھا نام بدل گیا، کام وہی رہا۔ انہوں نے سچا کا نشانہ ہی کیوں نہ بدل دیا جائے جو صحیح طریقہ ہے گاڑی کو ہٹری پر ڈالنے کا؟

فاضل مصنف کا دعویٰ ہے کہ صوفیائے معاشرے کی نامہ لاریوں اور حکمرانوں کی غلط کاریوں کے خلاف جگامہ آرائی کے بجائے عملی احتجاج کا انوکھا طریقہ اختیار کیا۔ لکھتے ہیں:

”آج مجاویب اور صوفیا کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ بستے گھر چھوڑ کر جنگلوں میں جا بیٹھے، خدا کے دیئے ہوئے رزق سے منہ موڑ کر تپوں پر گزارا کیا، خدا کے عطا کردہ پہناوے کو لتگوٹی یا پیوند لگے خرقے میں بدل دیا۔ خدا داد صحت کو سخت ریاضت کر کے برباد کر ڈالا اور کتے کہتے تالو خشک ہو جاتے ہیں کہ یہ کہاں کی ولایت ہے، یہ کیسی بندگی ہے، یہ کس طرح کا تصوف ہے؟ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے یوں تنقید اور تشنیع کے اڑنگے پر رکھا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ صوفیا سراپا احتجاج تھے، معاشرے کی بے انصافی پر، لوگوں کی بے حسی پر، حکمرانوں کی کوتاہیوں پر اور وہیوں لوگوں

کو. معاشرے اور حکمرانوں کو دعوت دے رہے تھے کہ ہمیں سادھو اور رہبان بن کر گھر بار چھوڑ دینے کا طعنہ دینے والو، ہزاروں، لاکھوں لوگ ہیں جو بے گھر ہیں اور کھلے آسمان کے نیچے گرمیوں میں کھل اور سردیوں میں ٹھٹھکے ہیں، انہیں تم نے چھتیں مہیا کر دی ہیں کہ ہماری فکر تمہیں لاحق ہو گئی ہے؟ مہو کے پیاسے رہ کر خدا کی ناشکر می کا الزام دینے والو! لاکھوں حلق خشک اور پیٹ خالی ہیں جو پانی کے گھونٹ اور روٹی کے لقمہ کو ترس گئے ہیں۔ کیا انہیں آب و دانہ مہیا کر دیا گیا ہے کہ ہم مورد الزام ٹھہرائے جائیں؟ ہمارے خرقہ پوش بننے پر عین برہیں ہونے والو، لاکھوں ننگے بدن پر سب طلب ہیں، انہیں ڈھانپنا مل گیا ہے کہ ہماری خرقہ پوشی تمہیں کھشک رہی ہے؟

کاش لوگ ان مجاذیب اور صوفیاء کے دلوں کی تپش اور روح کی لرزش کو دیکھ سکتے؟ تو سمجھ پاتے، صوفیاء نے کہہ کر یا لکھ کر نہیں بتایا، کر کے دکھایا اور زندگیاں بدل دیں۔ صوفیاء کا دنیا پر احسان ہے کہ انہوں نے کہا موڑ کاٹ کر منزل پر پہنچانے کے بجائے سیدھا راستہ اختیار کر کے مسافت کو کم کر دیا وگرنہ ہو سکتا تھا کہ کچھ لوگ کارواں سے بچھڑ جاتے، بعض راستے کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے اور بعض کہیں اتھاہ کھڑوں میں لڑھک جاتے۔ یہ بات دیکھ کر صوفیاء کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے کہ انبیاء کرام کی جانشینی کے مستحق اگر ہیں تو یہی صوفیاء کرام۔ کیونکہ انبیاء کرام نے بھی تو انسان کی محنت کو کم کر دیا ہے۔

اسی طرح کے طرز استدلال اور تجزیاتی انداز نے کتاب کو دلچسپ اور اپنے موضوع کی مناسبت سے انتہائی وقیع بنا دیا ہے۔

(۳) فاضل مصنف چونکہ خود بھی دین کا گہرا شعور اور شریعت کی پاسداری کا وافر جذبہ رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے کھلے ذہن کے ساتھ تصوف میں در آنے والی خرافات کی تردید کی ہے اور اجل صوفیاء کے حوالے سے تصوف کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔

(۴) ”روح تصوف“ میں تصوف کی اہمات کتب کے تفصیلی تعارف کے علاوہ فقرا

توکل، قناعت وغیرہ ایسے عنوانات کے تحت قاری کی ذہنی تربیت کا مواد ملتا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب تصوف کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالے کی ایک کامیاب کوشش ہی نہیں، دعوت و تبلیغ کے نقطہ نظر سے بھی ہر طرح سے افادیت کی حامل ہے۔

(۵) مصنف کا خطاب چونکہ مسائل کے بارے ہوئے عام انسانوں سے ہے۔ اس لیے انہوں نے کتب تصوف سے عبارتیں نقل کرتے ہوئے عربی، فارسی کے اصل متن کے بجائے صرف اردو ترجمے پر اکتفا کیا ہے جو تحقیقی نقطہ نظر سے تو یقیناً محل نظر ہے لیکن دعوت و تبلیغ کے نبوی انداز سے انتہائی قریب ہے مقصد اپنے علم و قابلیت کا اظہار نہیں بلکہ سلیم الطبع قارئین کو نظام خالقہی اور تصوف سے روشناس کرانا ہے۔

(۶) ”روح تصوف“ میں زبانی و بیان کی نزاکتوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے جو بجائے خود لائق تحسین امر ہے۔

ان خوبیوں کے پیش نظر یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عزیز محترم سید خورشید احمد گیلانی کی یہ علمی کاوش علمی اور دینی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرے گی۔

فریدیک سال کے کارپروازان مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی بہترین کوششوں کے طفیل ”روح تصوف“ خوش ذوق قارئین کے ہاتھ پہنچ رہی ہے۔

نثار پور راجن پور، ضلع ڈیرہ غازی خان

رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

سید ارشاد احمد عارف

مدیر صہ ماہی ”العارف“ لاہور

# رُوحِ تَصَوُّف

غلط فہمیوں کے ماحول میں کسی چیز کا اپنے اصل روپ میں سامنے آنا کسی قدر مشکل ہے اور جب تک گرد کی جھمی نہیں الگ کر کے اصل مآخذ کا مطالعہ نہ کیا جائے حقیقت کیونکر واضح ہو سکتی ہے، اس کا احساس تصوف کے بارے میں غلط العوام تاثر کا جائزہ لیتے ہوئے ہوتا ہے، تصوف کی غلط تعبیر، خود ساختہ تشریح اور من پسند توجیہ سے غلطیوں کا اور واہو اگر نام نہاد صوفیوں کا طرز عمل اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا، ورنہ رنگین شیشوں والی عینک کے بغیر تصوف کا مطالعہ کیا جائے تو آج کے مروجہ اور طینہ تصوف سے اصل تصوف نہ صرف الگ نظر آتا ہے بلکہ کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔ کہاں وہ تصوف اور کہاں یہ رسم درواج، ہر گروہ میں کالی بھٹیں ہوتی ہیں۔ تصوف کا اوارہ بھی اس سے محفوظ نہ رہا، مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ذرا سی کوتاہی پر سب کچھ قابل تفسیح قرار دے دیا جائے، تنقید کی سان عینی تیز ہو، پھر بھی اس قدر بے رحمی سر اسر زیادتی ہے کہ درست اور نادرست میں تمیز ہی اٹھ جائے۔

ظاہر اور باطن کی اصطلاح سے ہر فرد واقف ہے، تعلیم اور تزکیہ کو بھی جو فرانس نبوت میں سے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے، بس اسی تزکیہ اور تصوف کا نام باطن ہے جس طرح دیگر علوم و فنون مثلاً صرف، نحو، فقہ، منطق، فلسفہ اور معانی کا نام رکھنے سے ان کا شریعت سے متغائر اور مقصود ہونا لازم نہیں آتا بلکہ اسے علم کی ذیلی شاخیں کہا جاتا ہے۔

اسی طرح تصوف کو ایک مستقل ادارے اور باضابطہ تحریک کا نام دینے سے بھی شریعت سے علیحدگی اور تضاد ثابت نہیں ہوتا۔ بعض باتیں اعتنا اور جوارج سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض دل اور رُوح سے، دل اور رُوح سے متعلق امور کو تصوف کہا جاتا ہے یہ کوئی ایسی خطرناک بات نہیں جس پر شعلہ پا ہوا جائے۔ بعض احکام ظاہر سے متعلق ہوتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یا مثلاً نکاح، طلاق، بیع و شرا، حقوق الزوہین، قرضہ، رہن، لین دین، بیرونی مقدمات، شہادت، وصیت، تقسیم ترکہ، اور جیسے سلام و کلام، قنود و قیام، طعام و منام، مہمانی و میزبانی وغیرہ ان مسائل کو فقہ کہتے ہیں اور کچھ احکام باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے خدا سے محبت رکھنا کہ خالص دل کا معاملہ ہے، خدا سے ڈرنا، دنیا سے کم رغبتی، خدا کی مشیت پر راضی رہنا، حرص نہ کرنا، دین کے کاموں کو اخلاص سے کرنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا، خود پست نہ ہونا، غصہ کو ضبط کرنا وغیرہم ان اخلاق کو سلوک یعنی تصوف کہتے ہیں، بس یہ ہے تصوف جو بے نقیہ بنا ہوا ہے اور اُسے تو اپنا دیا گیا ہے، آج دنیا جن معاشرتی اور معاشی مسائل میں الجھی ہوئی ہے اور ہزاروں لاکھوں صفات اس کے حل کے لیے سیاہ اور بیش قیمت ذہنی و عملی قوت صرف کی جا رہی ہے۔ اسے دو باتوں کا علم ہو جائے اور تباہی کے کنارے پہنچی دنیا امن و عافیت کا سانس لے اور یہی دو باتیں تصوف کا اصل الاصول ہیں۔ ۱۔ خدا کا خوف اور دنیا سے بے رغبتی خدا کے خوف سے یہ فائدہ کہ ہر شخص میں جو اب وہی کا احساس زندہ و موجود رہتا ہے اور دنیا سے بے رغبتی کا حاصل یہ کہ انسان کے اندر حرص، طمع، فساد اور ہوس کے جذبات سرور پڑ جاتے ہیں جو تمام معاشرتی اور معاشی مشکلات کا باعث ہیں۔

تصوف نے یہ علاج ان مسائل کی صحیح تشخیص کے بعد تجویز کیا ہے، تصوف کا دعویٰ ہے کہ خدا سے بے خوفی نے معاشرتی مشکلات کو جنم دیا ہے مثلاً جھوٹ، غداری، قتل،

فساد، بد امنی، قانون شکنی اور ظلم وغیر ہم اور دنیا کی رغبت نے معاشی مسائل پیدا کیے ہیں۔ مثلاً ہوس زر، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، حب جاہ، سرمایہ پرستی، شکم پروری اور نفس پرستی وغیر ہم آج مدبرین عالم اکیڈمیاں قائم کرنے، کمیٹیاں بنانے، مجلسیں بٹھانے اجلاس بلانے، تحقیق کرنے، فلسفے مرتب کرنے، طریق کار تجویز کرنے اور لائحہ عمل تیار کرنے کے بجائے ان دو باتوں کو اپنی روح کے ساتھ عام کر دیں تو یہ مسائل اپنی موت آپ مر جائیں تصوف کی جن خالقاہوں نے غریبوں کو نفیس و لطیف دسترخوان پر بٹھایا اور امیروں کو روکھی روٹی اور سوکھی دال سے آشنا کیا اور دونوں کے دلوں سے ایک دوسرے کی کدورت و نفرت اور از خود تجویز کردہ معاشی و معاشرتی بُد کا خاتمہ کر دیا، کیا آج وہی تصوف کیونرم کا مقابلہ نہیں کر سکتا؟ تصوف کے جن اولیوں نے ہوا و ہوس کے بندوں کو ایک خدا کی بندگی پر لگا دیا، آج وہ وطنیت اور قومیت کے بُت نہیں توڑ سکتا اور خدا سے رشتہ نہیں جوڑ سکتا؛ اخلاق سے تہی دست دنیا آج بھی تصوف کو اس کی صحیح روح کے ساتھ اپنالے تو اس کے جملہ اخلاقی مسائل چٹکیوں میں حل ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تصوف کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کر کے اس سے مزاج کی نسبت پیدا کی جائے، یہ الگ بات ہے کہ تصوف اپنے دور انحطاط میں اتنا کچھ بدل گیا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ کسی صاحبِ دل کے صحیح تر الفاظ میں:-

”تصوف حال تھا لیکن اپنے دور انحطاط میں برہ حال بن گیا وہ احتساب تھا لیکن اب اس نے کتاب کی صورت اختیار کر لی، وہ استتار (یعنی پردہ) تھا لیکن اب وہ اشتہار نظر آنے لگا، پہلے وہ صدور کی عمارت تھا اب وہ غرور کا مرکز بن گیا، پہلے وہ نقشب تھا اب تکلف کا جامہ اس نے پہن لیا، پہلے وہ تخلق تھا اب وہ تعلق بن گیا، پہلے وہ قناعت

تھا اب اس نے حرص کا روپ دھاریا۔

تصوف کے ادارے دراصل اس وقت وجود میں آئے جب علم علماء کے ذہنی تعیش کا ذریعہ اور وعظ و نصیحت کے بجائے دوسرے کو نچا دکھانے کا ہتھیار بن گیا تھا۔ الفاظ و حروف تھے۔ مگر مفہوم و معنی سے یکسر خالی، عبادت و عبادت اور ادب و وظائف میں مشغول تھے، لیکن ان کی روح سے نا آشنا، حکمرانی کا ڈھانچہ اسلامی کہلاتا تھا مگر دنیا کی غربت اور حُب جاہ نے قوانین کو بازو پھیلایا اور حکومتی اداروں کو کھوکھلا کر دیا تھا، قال اقول کی فضائیں اور حق ہو کی صدا میں نہ کسی کے ذہن کا رنگ اتارتیں اور نہ کسی کے ساز دل کے تار ہلاتیں۔ تصوف نے اگر اس روح کو بیدار کرنے پر زور دیا جو علم کو با مقصد، زہد کو نتیجہ خیز، حکومت کو خادمِ خلق اور تعلیم و تدریس کو سرگرم بنادے، کہا جاتا ہے کہ تحت سلطنت نااہلوں کے ہاتھوں میں رہا مگر صوفیاء مراقبوں میں مست رہے اٹھ کر ٹوکا نہیں، تحریک کیوں نہیں چلائی، لوگوں کو اکسایا کیوں نہیں، جذبات کو بھڑکایا کس لیے نہیں، یہ ساری باتیں بجا، مگر ان کا حاصل کیا، یہی ناکہ ایک ہٹا دوسرا بیٹھا، نام بدل گیا کام وہی رہا۔ انہوں نے سوچا کا نشانہ ہی کیوں نہ بدل دیا جائے جو صحیح طریقہ ہے گاڑی کو صحیح ٹری پر ڈالنے کا! اس وقت حکومت کے نظام میں باقاعدہ شوری ہوتی تھی، عدلیہ کا وجود قائم تھا، قاضی اور منصف ہوتے، محاصل کا منظم ادارہ تھا سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو خدا کا خوف اور جو ابہری کا احساس نہیں تھا۔ جو جڑ ہے تمام اخلاق حسنة اور اعمال صادقہ کی، یہ نہ ہو تو شکل خواہ کیسی بھی ہونے کے اعتبار سے صفر ہوتی ہے۔

آج صوفیاء اور مجازیب کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ بے عمل احتجاج گھر چھوڑ کر جنگوں میں جا بیٹھے، خدا کے دیے رزق سے منہ موڑ کر پتوں پر گزارا کیا خدا کے عطا کردہ پناہ سے کو لنگوٹی یا سپوند لگے، خرچے میں بدل دیا۔ خدا اور صحت کو سخت ریاضت کر کے برباد کر ڈالا، اور کتے کتے ہالو خشک ہو جاتے

ہیں کہ یہ کہاں کی ولایت ہے؛ یہ کیسی بزرگی ہے؛ یہ کس طرح کا تصوف ہے ہمانکے  
 اگر غور کیا جائے تو ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے یوں تنقید اور تشنیع کے رنگے  
 پر رکھا جائے، اصل بات یہ ہے کہ صوفیاء سر اپا احتجاج تھے، معاشرے کی بے نقصانی  
 پر، لوگوں کی بے حسی پر، حکمرانوں کی کوتاہی پر، اور وہ یوں لوگوں کو، معاشرے اور حکمرانوں  
 کو دعوت دے رہے تھے کہ ہمیں سادھو اور رہبان بن کر گھر بار چھوڑ دینے کا طعنہ دینے  
 والو، ہزاروں، لاکھوں لوگ ہیں جو بے گھر ہیں اور کھلے آسمان کے نیچے گرمیوں میں لگیں  
 اور سردیوں میں ٹھٹھر گئے ہیں۔ انہیں تم نے چھتیں مہیا کر دی ہیں کہ ہماری فکر تمہیں لاحق  
 ہو گئی ہے؛ بھوکے پیاسے رہ کر خدا کی ناشکری کا الزام دینے والو، لاکھوں جلن منگ  
 اور لاکھوں پیٹ خالی میں جو پانی کے گھونٹ اور روٹی کے لقمے کو ترس گئے ہیں، کیا  
 انہیں آب و دانہ مہیا کر دیا گیا ہے کہ ہم مورد الزام ٹھہرائے جائیں؛ ہمارے خرقہ پوش  
 بیٹے پر چین بھین ہونے والو لاکھوں ننگے بدن پر من طلب ہیں۔ انہیں ڈھانپا مل گیا  
 ہے کہ ہماری خرقہ پوشی تمہیں کھٹک رہی ہے؛ کاش لوگ ان مجاذیب و صوفیاء کے  
 دلوں کی تپش اور روتوں کی لرزش دیکھ سکتے، سمجھ پاتے، صوفیائے نے کہہ کر یا لکھ کر نہیں  
 بتایا کر کے دکھایا اور زندگیاں بدل دیں، صوفیاء کا دنیا پر احسان ہے کہ انہوں نے لمبا  
 موڑ کاٹ کر منزل پر پہنچانے کے بجائے سیدھا راستہ اختیار کر کے مسافت کو کم کر دیا  
 وگرنہ ہو سکتا تھا کچھ لوگ کارواں سے بچھڑ جاتے، کچھ تھک ہار کر بیٹھ جاتے، بعض راستے  
 کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے اور بعض کہیں اتھاہ کھڈوں میں لٹھک جاتے، یہ بات  
 دیکھ کر صوفیاء کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے کہ انبیاء کی جانشینی کا اگر کوئی مستحق ہو سکتا  
 تھا تو یہی صوفیاء تھے کیونکہ انبیاء نے بھی تو انسان کی محنت کو کم کر دیا ہے، ڈھانچہ پڑا  
 تھا صوفیاء نے روح پھونک دی۔ جسم موجود تھا صوفیاء نے جان ڈال دی اور وہ وہیں  
 سے چلنے کے قابل بن گیا۔ کون کہتا ہے۔ صوفیاء دنیا کے ہنگاموں اور زندگی کی سرگرمیوں



سے دُور تھے، کس نے کہا ہے کہ صوفیاء نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کی تعلیم نہیں دیتے تھے؛ کون کہہ سکتا ہے کہ صوفیائے تعلیم و تعلم کو خیر باد کہہ دیا؟ ہاں البتہ وہ دنیا کو سلجھانے میں سرگرم تھے مگر الجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مرغابی کی طرح غوطے تو کھاتے تھے مگر بال و پر آلودہ کرنے پر آمادہ نہ تھے، اُن کے ہاں بھی نماز تھی، روزہ تھا، حج تھا، زکوٰۃ تھی، اور جہاد تھا۔ مگر وہ پانچ وقت کی نماز کے ساتھ ساتھ پوری زندگی کو نماز بنانے کا داعیہ رکھتے تھے وہ صرف پانچ وقت خدا کے ہاں حاضر ہونے پر ہی نہیں ہمہ وقت خدا کے ہاں حاضری پر زور دیتے تھے، وہ نہ کا رخ کعبہ کی جانب موڑنا کافی نہ سمجھتے تھے جب تک دل رب کعبہ کے آگے نہ جھک جاتا، وہ العناظ کی ادائیگی کو ضروری جانتے تھے لیکن معافی کو دل میں اتارنا اس سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے تھے، روزہ اُن کے ہاں بھی تھا مگر صرف یہ نہیں کہ پیٹ کو روٹی اور پانی سے خالی رکھا جائے بلکہ دل کو ادھام و خرافات سے بھی خالی رکھنا ضروری تھا، وہ صرف دن بھر منہ پر تالا لگانا لازمی نہ سمجھتے بلکہ ہر وہ سوتا بند کر دیتے جہاں سے شیطان کچھ بھی داخل کر سکے۔ وہ ایسے روزے کو کوئی اہمیت نہ دیتے جس کا نتیجہ ضبط نفس کی صورت میں نہ نکلے وہ ایسی بھوک پیاس کو پسند نہ کرتے جو کسی بھوکے پیاسے کی بھوک پیاس کا احساس پیدا نہ کرے، وہ صرف پیٹ کے روزے کے قائل نہ تھے، وہ زبان، آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں اور دماغ کا بھی روزہ رکھتے تھے، زکوٰۃ کو بھی وہ فرض جانتے تھے مگر ڈھائی فیصد پر ہی قناعت نہ کر بیٹھتے اُن کے ہاں سب کچھ دے دینا زکوٰۃ تھا اور پھر یہ کہ تجوری سے سکوں کا نکال دینا ہی اصل زکوٰۃ نہ سمجھی جاتی، جب تک دل کے نہاں خالوں سے حسبِ مال و زر کو دس نکلا نہ مل جاتا، زکوٰۃ سے مال پاکیزہ ہوتا ہے وہ دل کی پاکیزگی کو اس سے کہیں زیادہ اہم سمجھتے حج کے لیے وہ بھی جاتے، مگر مقصود صرف کعبہ کا دیدار نہ ہوتا بلکہ رب کعبہ کی ملاقات کو اولیت دیتے، کعبے کے کوٹھے کا طواف ہی کافی نہ سمجھتے وہ تو خدا کے حکم پر پروا نہ دار

جھومنے کو روح حج سمجھتے تھے، منیٰ میں میڈھے کی قربانی سے آگاہ تھے لیکن نفس لعیم کا ذبح کرنا ان کے نزدیک فرضِ اولین تھا، عرفات میں جسوں کے اجتماع کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے روحانی اور قلبی ملاپ کے وہ علمبردار تھے، جہاد کا مفہوم وہ جانتے تھے مگر صرف اتنا ہی نہیں کہ میدانِ جنگ میں تلوار سے لڑا جائے بلکہ وہ تو نفس اور شیطان کے ساتھ جہاد کو "جہادِ اکبر" کا نام دیتے تھے وہ جہاد کو ماستے اور جانتے ہوئے بھی خواہشِ نفس سے لڑنے کو جہاد کی معراج کہتے تھے۔

علم، سوز و ماغ یا سوزِ جگر | صوفیاء کے ہاں تعلیم و تعلم کا پرچار ہا ہے، لیکن وہ علم کو یقین کے معنوں میں لیتے تھے، ان کے ہاں سوز و ماغ

اور "سوزِ جگر" میں واضح فرق تھا۔ وہ علم سے صرف و ماغ ہی نہیں جلاتے بلکہ اپنا سراغ پاتے تھے، انہوں نے علم کو الفاظ کی شعبہ بازی ہرگز نہ بننے دیا، وہ علم کو تن پر مارنے کی بجائے من پر مارنے کو مقدم جانتے تھے، ان کے ہاں صرف ہدایہ کی عبارت خوانی کافی نہ تھی۔ ہدایت "اصل مقصد تھا، وقایہ" کی ورق گردانی سے کہیں اہم "تعموی" تھا، وہ کتیز، قدوری کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کے بجائے کتابِ دل "پرٹھنے پر زور دیتے تھے۔ وہ علم کے نخل ہونے کے قائل تھے مگر یقین کے بغیر اسے بے رطب گردانتے تھے، انہیں علم کے "یار اور تار" ہونے سے پوری واقفیت تھی۔ علم کے "حجۃ اللہ علیٰ ابن آدم" سے کھل باخبر تھے۔ ان کا عقیدہ علم کے منزل نہیں چراغِ راہ ہونے پر تھا۔ وہ "مکتب کی کرامت" کے قائل ہوتے ہوئے بھی "فیضانِ نظر" کی طرف مائل رہے، الغرض زندگی کے ہر شعبے سے صوفیاء کو تعلق رہا، دلچسپی رہی، مگر دل کو کھینے نہ دیا پھینے نہ دیا۔ وہ دنیا میں شاغل ضرور رہے، لیکن رب سے غافل نہ ہو سکے، مخلوق کی جانب مائل تو رہے۔ مگر اللہ کے ساتھ واصل بھی رہے۔ بس یہ تھا ان کا ترک، تجسس و ادا، انقطاع، اگر یہ سب کچھ خلاف شرع ہے تو بتایا جائے کہ دین کی روح کیا ہے؟

تصوف کیا بن گیا ہے۔ سے پہلے "تصوف کیا تھا" کو جان لیا جائے تو بہتر ہے۔ ہم ان اوراق میں بس اسی ایک بات کو بیان کرتے ہیں، اپنی طرف سے کچھ بھی نہ ہوگا بیان ہوگا ان صوفیاء کا جنہیں تصوف کے "امام" کا منصب حاصل ہے اور حوالہ ہوگا، ان کتابوں کا جو تصوف کی "اہمات کتب" کہلاتی ہیں، لیکن سب سے پہلے ہم اس حدیث کی تشریح کریں گے جو "حدیث جبریل یا حدیث احسان" کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے الفاظ ہیں۔ اس حدیث میں جناب جبریلؑ نے ایک اعرابی کی شکل میں صحابہ کرامؓ کی تفسیم و تعلیم کے لیے بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں استفسار کیا تھا، اس حدیث کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے، اشعۃ اللمعات میں شیخ فرماتے ہیں:-

"جان لو کہ دین اور اس کے کمال کی بنیاد فقہ، کلام اور تصوف پر ہے۔ اس حدیث نے ان تینوں مقاموں کا بیان کر دیا، اسلام کا یہ اشارہ فقہ کی طرف ہے جو اعمال و احکام شرعیہ کے بیان کا متکفل ہے اور ایمان، یہ اشارہ اعتقادات کی طرف ہے جو کہ علم اصول (کلام) کے مسائل ہیں اور احسان اشارہ اصل تصوف کی طرف ہے جس سے خدا کی طرف صدق توجہ ہے، تصوف کے تمام معانی جن کی طرف تمام مشائخ طریقت نے اشارہ کیا ہے اسی معنی کی طرف راجح ہیں، فقہ، کلام اور تصوف لازم و ملزوم ہیں، کہ ایک دوسرے کے بغیر ان میں سے کوئی کامل نہیں ہوتا کیونکہ فقہ بغیر تصوف کے اور تصوف بغیر فقہ کے صورت پذیر نہیں ہوتا اس لیے کہ کلام الہی بغیر فقہ کے پہچانا نہیں جاتا اور فقہ بغیر تصوف کے کامل نہیں کیونکہ عمل بغیر صدق توجہ کے تمام کامل نہیں ہوتا اور یہ دونوں بغیر ایمان کے صحیح نہیں ہوتے جس طرح کہ روح و جسم ایک دوسرے کے بغیر وجود و کمال اعتباراً

نہیں کرتے اسی واسطے امام مالکؒ نے فرمایا ”جو شخص صوفی بنا اور فقیر نہ ہوا وہ زندیق ہو گیا“ اور جو فقیر بنا اور صوفی نہ ہوا، وہ فاسق ہو گیا اور جو دونوں کا جامع ہو وہ بے شک محقق بن گیا۔ کمال جامعیت یہی ہے۔“

تصوف کیا ہے؟ یہی کچھ ہے جو اوپر بیان ہوا نہ اس سے زیادہ نہ کم اور کسی شخص کو تصوف کی اس تشریح و تعبیر پر کوئی اعتراض کیوں کر ہو سکتا ہے؟ تشریح و تعبیر کرنے والا ”مرج البحرین“ شخصیت کا حامل ہے۔ یعنی علوم عقلیہ و نقلیہ کا جامع ہے اور حسن اتفاق کہ کتاب ”مرج البحرین“ کا مصنف بھی ہے، لطف برآں یہ کہ شیخ محقق تصوف کے اصولی وکیل اور شارح نہیں بلکہ اس میدان کے مرد ہیں، انہوں نے تصوف کو پڑھ کر یا کناروں سے دیکھ کر ہی نہیں پرکھا۔ بلکہ اس میں غوطہ زن ہو کر جانچا اور اپنی رائے پیش کی جو اوپر نقل کی گئی ہے یہی بات ان کے معاصر اور برصغیر پاک و ہند کی قد آور روحانی و سیاسی شخصیت شیخ احمد سرمدی المعروف مجدد الف ثانیؒ نے بھی اپنے الفاظ میں پیش کی ہے شیخ مجددؒ بھی شیخ محقق کی طرح تصوف کے درمنا آشنا اور اداس شناس تھے شیخ مجددؒ اپنے ایک رسالے حقیقت تصوف کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

”شرعیات کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے وہ دو قسم کے ہیں بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے۔ جیسے کلمہ پڑھنا، نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ، والدین کی خدمت وغیرہم انکو مامورات کہتے ہیں اور کلمات کفر کتنا، شرک کے افعال کرنا، زنا، چوری، سود، رشوت وغیرہ ان کو منہیات کہتے ہیں، بعض اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے، جیسے ایمان و تصدیق، عقائد حقہ، صبر و شکر، توکل رضا، احسان محبت خدا اور رسول ان کو مامورات و فضائل اور عقائد باطلہ، بے صبری، ناشکری، ریاء و عجب، تکبر، یہ مناسی و ردائل ہیں، جس طرح قرآن میں

اقیموا الصلوٰۃ اور اتوا الزکوٰۃ موجود ہے۔ اسی طرح یا ایہا الذین آمنوا، اصبروا و اشکروا اللہ بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر کتب علیکم الصیام اور اللہ علی الناس حج البیت پاؤ گے تو دوسرے مقام میں یجنہو و یحبونہ اور الذین آمنوا شد حبا اللہ بھی پاؤ گے جہاں قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی ہے اس کے ساتھ یراد ان الناس بھی ہے۔ اگر ایک مقام پر تارک نماز و زکوٰۃ کی خدمت ہے تو وہاں تکبر و عجب کی برائی بھی ہے۔ اسی طرح احادیث کو دیکھو جس طرح ان میں ابواب نماز، روزہ، بیح و شرارہ، اور نکاح و طلاق پاؤ گے، اسی طرح ابواب ریاد کبر کو بھی دیکھو گے، اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں اسی طرح اعمال باطنہ بھی حکم الہی ہیں کیا اقیموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے تو اصبروا و اشکروا امر کا صیغہ نہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہر احکام سب ہی باطن کی اصلاح کے لیے ہیں،

آپ نے ملاحظہ فرمایا بس یہی وہ تصوف ہے جس کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہا اور لکھا جاتا ہے کہیں اسے رہبانیت ثابت کیا جاتا ہے اور کہیں اس کا رشتہ سادھوؤں سے جوڑا جاتا ہے۔ کبھی اسے شریعت کا متوازی نظام بنایا جاتا اور کبھی ہندی اور یونانی فلسفے کا چربہ کہا جاتا ہے کچھ لوگ اسے زندگی گریز ادارہ اور کچھ مذہب گو سفند قرار دیتے ہیں، بعض کے نزدیک مسائل حیات سے چشم پوشی کا دوسرا نام تصوف ہے اور بعض کے نزدیک یہ تصوف یا سیت و قنوطیت کا علم بردار ہے کوئی اسے باطنیوں کا تائید سمجھتا اور کوئی اشرافیوں اور مشائیوں کا ترجمان گردانتا ہے۔ حالانکہ سادہ

سی بات تھی جسے اندیشہ عمیم نے فقط ”زیب داستان“ کے لیے بڑھا دیا ہے، اور پر کے دو اقتباسات پڑھ کر تصوف نہ شریعت سے متوازی نظام قرار پاتا ہے اور نہ زندگی گریز جہان کا حامل نظر آتا ہے نہ اس میں باطنیت کی بوہے اور نہ اشراقیت کی کچھ بھی تو نہیں مگر انصاف کی نظر چاہیے۔

ممتاز موزخ اور فلسفہ عمرانیات کے بانی علامہ ابن خلدون اپنے شہرہ آفاق ”مقدمے میں تصوف کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

”تصوف کے مقاصدِ اصلیہ یہ ہیں کہ انسان عبادتِ الہی میں جان کھپائے پوری طرح اللہ کا ہو جائے اور دنیا اور دنیا کی لغویات اور خرافات سے بالکل منقطع ہو جائے، عام دنیا دار جن چیزوں پر مٹے پڑے ہیں یعنی لذات و نیویہ اور حبِ مال و جاہ سے قطعاً کنارہ کش ہو جائے عبادت کے لیے عزت نشینی اور گوشہ نشینی پسند کرے۔“

فرمائیے، عبادتِ الہی میں جان کھپانا اور پوری زندگی کو عبودیت و بندگی کے قالب میں ڈھالنا شریعت کا مطالبہ نہیں اللہ کے لیے خفیہ، یعنی یکسو ہونا امر خداوندی نہیں؟ دنیا اور دنیا کی لغویات سے کنارہ کشی اسوۂ نبوی نہیں؟ حبِ جاہ و مال سے پاک رکھنا اور لذاتِ دنیوی میں محو و مستغرق نہ ہونا سرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں؟ عبادت کے لیے انہماک اور یکسوئی شریعت کا حکم نہیں؟ اللہ سے لو لگانے اور فکر و اعتبار کھینے غفلت کا اہتمام کرنا سنت نہیں؟ یہ سب کچھ ٹھیک ہے تو تصوف نے کیا غلط کیا اور کہا ہے کہ موردِ الزام ٹھہر گیا ہے، اسے تو معمولی عقل والا آدمی بھی سمجھ لیتا ہے کہ نام بدلنے سے کام کی حقیقت نہیں بدلتی، مگر تصوف کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ یہی یہ بات کہ تصوف و سلوک کے بارے میں کچھ لوگوں نے اپنے قول و عمل سے خلاق گریزی، شعبدہ بازی اور اس طرح کی خرافات کا جو تصور دیا ہے وہ صحیح ہے

یا غلط ہے تو ہمارے خیال میں بنی سوچے سمجھے کسی ادارے یا تحریک سے کوئی توقع وابستہ کر لینا جس طرح علمی سوچ نہیں کھلا سکتی اسی طرح غلط قیاسات کے باعث اصل تحریک کے اصولوں کو نظر انداز کر دینا بھی دیانت علمی کے منافی ہے، جنہوں نے تصوف کو امورِ غیب کے انکشاف کا ذریعہ سمجھایا محض کشف و کرامات کا وسیلہ وہ بھی اور جنہوں نے غیر ثقہ نظریات اور عوام کے رجحانات کو بنیاد بنا کر تصوف کی ترویج و تخلیط کی، ہمارے نزدیک انہیں بھی ٹھوکر لگی ہے، تصوف و سلوک کا خلاصہ کیا ہے؟

مولانا اشرف علی تھانوی کہتے ہیں:-

- ۱- نہ اس میں کشف و کرامت ضروری ہے۔
  - ۲- نہ قیامت میں بخشوانے کی ذمہ داری ہے۔
  - ۳- نہ دنیا کی کار بر آرمی کا وعدہ ہے۔
  - ۴- نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی توجہ سے مرید کی از خود اصلاح ہو جائے۔
  - ۵- نہ ایسے باطنی کیفیات پیدا ہونے کی کوئی میعاد مقرر ہے کہ ہر وقت یا عبادت کے وقت لذت سے سرشار رہے، عبادت میں خطرات ہی نہ آئیں۔
  - ۶- نہ ذکر و شغل میں الوار و تجلیات کا نظر آنا یا کسی غیبی آواز کا سنانا دینا ضروری ہے۔
  - ۷- نہ عمدہ عمدہ خوابوں کا نظر آنا اور العلامات کا صحیح ہونا لازمی ہے بلکہ اصل مقصود حق تعالیٰ کا راضی کرنا ہے جس کا ذریعہ شریعت کے حکموں پر پورے طور پر چلنا ہے۔
- ان تشریحی اور توضیحی اقتباسات کے بعد ضروری ہے کہ قدیم تصوف کیا ہے؟ صوفیاء اور ان کی عظیم تالیفات سے تصوف اور صوفی کے بارے میں بیان کیے گئے خیالات و افکار کو بغیر کسی لاحقے اور سابقے کے پیش کر دیا جائے تاکہ حقیقت نفس الامری واضح ہو جائے۔ تصوف ابتدا میں کیا تھا؟ تصوف کے پران پر لٹھانے والے کن افکار کے حامل تھے؟ ان کے نزدیک تصوف کی تعریف کیا تھی؟ وہ

کس چیز کو تصوف کی روح قرار دیتے تھے یہ اور ایسی دوسری باتیں صوفیاء کی تحریکوں کے اقتباسات سے ہمارے سامنے آجائیں گی اور ہم تصوف کا صحیح تعارف حاصل کر سکیں گے۔ آسمان تصوف کے مہر منیر شیخ ابوالقاسم جنید بغدادیؒ جو سرخیل اولیاء ہونے کے ناطے "سید الطائفہ" کے عظیم الشان لقب سے طقب ہیں، تصوف کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"تصوف مخلوق کی موافقت کرنے سے دل کو پاک رکھنا، بشری صفات (مذمومہ) سے علیحدگی اختیار کرنا، نفسانی خواہشات سے اجتناب کرنا، روحانی نفوس سے میل جول رکھنا، علوم حقیقی سے تعلق رکھنا، ہر لحظہ ایسے کام بحال کرنا جو اولیٰ اور افضل ہوں تمام امت محمدیہ کی خیر خواہی کرنا حقیقی طور پر اللہ سے وفا کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کی پیروی کرنا ہے۔"

شیخ جنید بغدادیؒ سے بھی پیشتر تصوف کے ممتاز رہنما اور مشہور صوفی شیخ عبد اللہ تترجی مسلک تصوف کی تشریح یوں کرتے ہیں:-  
ہمارے مسلک کے اصول سات ہیں۔

- ۱۔ التمسک بکتاب اللہ تعالیٰ (کتاب اللہ سے مضبوط تعلق،
- ۲۔ اقتداء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (پیروی رسول صلی اللہ علیہ وسلم،
- ۳۔ اکل اللال (رزق حلال)
- ۴۔ کف الاذی (ایذارسانی سے پرہیز)
- ۵۔ اجتناب الاثام (گناہوں سے بیزاری اور نفرت)
- ۶۔ التوبہ (اللہ کی جانب رجوع)
- ۷۔ اداء الحقوق (خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی)



اسی بات کو بعض صوفیاء نے دوسرے لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

- (۱) ادواء العز النفس (عز النفس کی ادوائیگی اور حقوق کی رعایت)
- (۲) اجتناب المحارم (خدا کی حدود کی پاسداری، منکرات سے پرہیز اور محرمات کی پابندی۔)
- (۳) قطع العلائق (دنیا اور اہل دنیا سے دل ہٹا کر خدا کے لیے یکسو ہو جانا، تمام رشتوں کو چھوڑ کر خدا سے رشتہ جوڑ لینا)
- (۴) معالقتہ الفقر (مسائل کے بجائے آزمائش کی زندگی بسر کرنا، معائب و آلام کا خوش دلی سے استقبال۔)
- (۵) ترک الطلب (دل کو آرزوں سے خالی کر لینا، امیدوں کو مختصر کرنا اور خدا کے علاوہ کسی سے حاجت برآری کی توقع نہ رکھنا)
- (۶) انقطاع الی اللہ (سب سے کٹ کر خدا کا ہو جانا، اللہ کے لیے کٹے اور چڑھنے کا جذبہ پیدا کر لینا) تصوف کے چمن میں بھر سے رنگارنگ پھولوں سے وامن سجاتے اور ان کی خوشبو سے شام جاں کو معطر کرتے اور رنگ و بو کی دنیا کی سیر فرماتے ہوئے آگے چلے اور دیکھتے تصوف کیا ہے؟ اور صوفی کون ہے؟ کسی نے شیخ جنید بغدادیؒ سے پوچھا، تصوف کیا ہے؟ جواب میں فرمایا:-  
”حق تعالیٰ کے ساتھ پیوست ہو جانا، یہ کیفیت صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب نفس، روح کی قوت اور حق کے ساتھ قائم رہنے کی وجہ سے اسباب سے بے تعلق ہو چکا ہو۔“
- شیخ ابوالحسن نورمیؒ یوں گویا ہیں:-  
”تصوف کیا ہے؟ تمام خطوطِ نفس کا ترک کر دینا۔“
- حضرت شیخ ابن عطاءؒ کا ارشاد ہے:-  
”حق تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار رہنے کا نام تصوف ہے۔“

شیخ ابوعلی قزوینی فرماتے ہیں :-

”التصوف هو الاخلاق الرّاضيه (تصوف اچھے اخلاق کو کہتے ہیں)۔“  
تصوف کی شہرہ آفاق کتاب رسالہ قشیریہ کے مؤلف امام ابو القاسم القشیری کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ دیاور ہے کہ یہ کتاب بقول مصنف، تصوف کے بارے میں پیدائشہ غلط فہمیوں کے ازالے کی خاطر لکھی گئی تھی، امام نے اپنی بزم مختلف چراغوں سے سجائی ہے، اور مختلف بزرگوں کے اقوال تصوف کے موضوع پر بڑی عمدگی سے ترتیب دے کر کتاب کو لوگوں کے سامنے گلہ سے کی صورت میں پیش کی ہے۔

شیخ ابوعلی رودباری لب کشاہیں۔

”تصوف باہم مذہب ہمہ تن سنجیدگی ہے، لہذا اس میں ہنسی اور مذاق

کو نہ چلاؤ۔“

حضرت شیخ ابو محمد حسریری کا تبصرہ :-

”یہ ہر اعلیٰ اخلاق میں داخل اور ہر ذلیل خلق سے نکلنے کا نام ہے۔“  
حضرت شیخ محمد بن علی قصاب کا بصیرت افروز تجربہ،  
”تصوف وہ کریمانہ اخلاق ہیں جو کریم زمانہ میں کریم آدمی سے کریم لوگوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے ہیں۔“

حضرت شیخ سمون کی فلسفہ آمیز رائے،

”تصوف کیا ہے؟ تصوف یہ ہے کہ تو کسی چیز کا مالک نہ بنے اور نہ کوئی

چیز تمہاری مالک بنے۔“

حضرت شیخ ابو بکر الکتانی کا بے تکلف اظہار خیال،

”تصوف اخلاق حسنہ کا نام ہے، جس کے اخلاق تم سے بہتر ہوں گے

وہ صوفی ہونے میں بھی تم سے بہتر ہوگا۔  
 حضرت شیخ ابوعلی رودباریؒ کا محبت بھرا جملہ۔  
 ”محبوب کے در پر ڈیرے ڈال دینے کا نام تصوف ہے خواہ وہ دھکے  
 ہی کیوں نہ دے۔“  
 انہی کا فرمانا ہے۔

”معاذ اللہ! ہاتھ دل کی خوشی کا نام تصوف ہے۔“  
 شیخ ابوالحسن مزینؒ کا فرمانا ہے۔  
 ”حق تعالیٰ کی اطاعت کرنے کا نام تصوف ہے۔“  
 الشیخ الاستاذ ابوسلم معلومیؒ ارشاد فرماتے ہیں۔  
 ”تصوف اللہ کی رضا پر اعتراض نہ کرنے کا نام ہے۔“  
 برصغیر پاک و ہند میں تشریف لانے والے قدیم صوفی بزرگ مایہ ناز و حسانی  
 شخصیت اور عوامی محبت اور عقیدت کے بام بلند پرفاخر مرشد کمال شیخ علی الجویری  
 المعروف داماد گنج بخشؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب ”کشف المحجوب“ میں تصوف کے موضوع  
 پر مختلف بزرگان دین اور اہل صوفیا کے اقوال کا انتخاب پیش فرماتے ہیں۔  
 حضرت داماد نے شیخ ابوالحسنؒ کا ایک قول نقل کیا ہے۔

”..... لیس التصوف رسوما ولا علوماً ولكنہ الاخلاق (تصوف کسی خاص  
 وضع قطع یا علمی سادات کا نام نہیں بلکہ اخلاقِ حسنہ کا نام ہے)۔“  
 حضرت شیخ ابوالحسین نورانیؒ تصوف کا تعارف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔  
 ”التصوف ہواحریۃ، والفتوۃ وترک الکلفۃ والسما، وبذل الذنیات (تصوف  
 دل کی آزادی، جواں ہمتی، رسمی کلفیات سے دستبرداری، سخاوت اور  
 زرو مال سے بیزاری کا نام ہے)۔“

جناب داتا گھڑتقوت کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

”دین کی اصل روح اور اس کی جان احکام الہی کی اخلاص و محبت کے ساتھ پیروی ہے..... اور اسی کو ہم تصوف کہتے ہیں۔“

حضرت شیخ حصریؒ کا تصوف کے بارے میں کیا نقطہ نظر ہے، ملاحظہ ہو،

”تصوف نام ہے ضمیر کو مخالفتِ حق سے محفوظ رکھنے اور اس کی جلا و نورانیت کو کدورت اور ہام سے بچانے کا۔“

دنیا کے تصوف کی جانی بچانی شخصیت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نزدیک بھی تصوف کا وہی مفہوم ہے جو دیگر ارباب تصوف کے ہاں ہے جسے ہم اقتباسات کی صورت میں پیش کر چکے ہیں، شیخ اپنی مختصر مگر جامع تالیف ”فتوح الغیب“ میں تصوف کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

”تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے۔ سخاوت ابراہیمؑ، رضائے اسماعقؑ، صبر الیوبؑ، مناجات زکریاؑ، غربت یحییٰؑ، خرقہ پوشی موسیٰؑ، تجرؤ عیسیٰؑ اور فقر محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔“

یہاں تک تو ہم نے تصوف کے بارے میں صوفیاء کے نظریات و خیالات کا پتلا اور خلاصہ پیش کیا ہے جس سے کہیں بھی یہ مترشح نہیں ہوا کہ تصوف شریعت سے ہٹ کر کوئی نظام ہے، یا شریعت کے علاوہ کوئی بدعت ہے، بلکہ شریعت نے جو احکام و اوامر قانون کی زبان میں صادر کیے ہیں، تصوف انہیں دل نشین اور موثر پیرائے میں پیش کر کے جذباتِ محبت ابھارتا اور اطاعت و القیاد پر اکساتا ہے، ہم ایک بار پھر اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ اس چیز کی باضابطہ طور پر منظم صورت میں قیام کی ضرورت نہ پڑتی اگر احکام شرع الفاظ و حروف کے بازگروں کے ہاتھ کھلوانا نہ بن چکے ہوتے اور یوں روح شرع نہ کھلی جا رہی ہوتی۔

اب ہم اس عنوان میں صوفیاء کے نزدیک صوفی کون ہے؟ کی تشریح کرتے ہیں۔ کیونکہ بعض نام نہاد اور لبادہ پوش لوگوں نے تصوف میں گھس کر خود تو اصلاح پذیر ہونے سے رہے الٹا تصوف اور طریق صوفیاء کو بدنام کر دیا، ایسی کالی بھڑوں کی نشاندہی ہر زمانے میں ہوتی رہی اور ان سے اظہارِ برائت کیا جاتا رہا، تصوف کی چند بنیادی اور اصولی کتابوں کی وجہ تالیف ہی یہی ہے کہ نام نہاد صوفیوں کو بے نقاب اور تصوف کے بارے میں ان کے ذریعے پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے، ان میں تعارف، رسالہ شیریہ، کشف المحجوب اور عوارف المعارف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امام ابو بکر محمد بن اسحاق نے بھی دھندھات کرنے کی اپنے تئیں کوشش کی، امام ابوالقاسم العشیریؒ نے بھی قلم کی نوک سے غلط فہمیوں کی تہہ کھرچنے کی سعی فرمائی، حضرت داماد نے بھی حدائے احتجاج بلند کی اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے بھی تصوف کے دامن پر سے وارغ و صوبوں کو دور فرمایا، الغرض ہر ایک نے آئینہ تصوف کو گرد سے پاک صاف کیا اور اس کا چہرہ نکھارا۔ حضرت شیخ ضیاء الدین سہروردیؒ نام نہاد صوفیوں پر یوں برستے ہیں۔

”نام نہاد صوفی ”طبع“ کو ”ارادہ“ کہتے ہیں۔ ”سوادب“ کا نام ”اخلاص“ رکھا ہے۔ حق سے خروج کو ”شطح“ کہتے ہیں اور مذموم چیزوں سے ”تلذذ“ کو ”تطیب“ (اچھی چیزوں سے فائدہ اٹھانا) کہتے ہیں، خواہشاتِ نفس کی پیروی کو ”ابتلاء“ اور دنیا کی طرف رجوع کو ”وصول“ اور بد خلقی کو ”صولت“ (دبذب) اور بخل کو ”شکاوة“ (احتیاط) اور بد زبانی کو ”طامت“ کا نام دے رکھا ہے۔ حالانکہ یہ صوفیاء کا طریقہ نہیں۔“

اور اس کے مقابلے میں حضرت شیخ ضیاء الدین سہروردیؒ کے نزدیک صوفیاء کے طریقے میں جو چیزیں شامل ہیں، ان کے بارے میں ان کی تحریر سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

صوفیوں کے اخلاق میں علم، تواضع، نصیحت، شفقت، برداشت، موافقت، احسان، مدارات، ایثار، خدمت، الفت، بشاشت، فتوت (مردانگی)، کرم، بذل جاہ، تملط، معروت، طلاقت، (کشادہ روٹی) سکون، وقار، جملہ مسلمانوں اور بالخصوص جوان پر زیادتی کرے اس کے لیے دعائے خیر، ان کی تعریف کرنا، ان کے ساتھ حسن ظن رکھنا، اپنے آپ کو حقیر سمجھنا، بھائیوں کی توقیر کرنا، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں پر رحم، جو کچھ کسی کو دے اگرچہ بہت ہو اس کو کم سمجھنا اور جو کچھ کسی سے لے اگرچہ وہ کم ہو اس کو زیادہ جاننا یہ سب باتیں داخل ہیں۔

اب ہم بلا کم و کاست ”صوفی“ کے بارے میں صوفیاء کی آراء کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، عام طور پر لوگ صوفی اسے کہتے ہیں جس کی علامات یہ ہوں، سر تراشیدہ ہو، خرقة پوش ہو، شکل و صورت سے مسکین ہو، ہاتھوں بالا التزام تسبیح رکھتا ہو، حق ہو کی ضربیں مارتا ہو، بیوی بچوں سے بے نیاز ہو، گھر بار سے پاک ہو، وغیرہم حالانکہ واقع میں ایسا نہیں، کیونکہ جس طرح کوئی شخص طیر می ٹوپی اور بگڑ کر بیٹھا ہو وہ سکندر نہیں ہو سکتا اسی طرح جو سر منڈالے وہ قلندر نہیں بن جاتا جس طرح سکدر می کے کچھ تقاضے ہیں اسی طرح قلندر می کے بھی کچھ مطالبے ہیں اور او و ظالفت ہی سے اگر تصوف کے تقاضے پورے ہو جاتے تو آج دنیا کا بیشتر حصہ صوفی کہلاتے کا مستحق ہوتا، صوفی کو ان کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، جس کی تفصیل ہمیں تصوف کی مستند کتابوں میں ملتی ہے۔

سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی فرماتے ہیں۔

”صوفی کی مثال زمین کی سی ہے جسے نیک اور بدکار دونوں روندتے ہیں یا بادل کی سی ہے جو ہر چیز کو سیراب کرتا ہے“

شیخ حسین بن منصورؒ اس سے بھی کڑا امتیاز پیش کرتے ہیں۔  
 ”صوفی کی ذات یکتا ہوتی ہے، نہ کوئی اللہ کے سوا اسے قبول کرتا ہے  
 اور نہ یہ اللہ کے سوا کسی کو قبول کرتا ہے۔“  
 شیخ ابوالحسین نورؒ کے الفاظ میں صوفی کی تعریف،  
 ”صوفی کی تعریف یہ ہے کہ اسے محتاجی کے وقت سکون ہو اور اگر کچھ پاس  
 ہو تو ایشیا کر دے۔“

شیخ ابوبکر شبلیؒ کا تعارف کرنے کا انوکھا انداز۔  
 ”صوفیاء کرام حق تعالیٰ کی گود میں بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔“  
 فکر انگیز لہجے میں شیخ ابوترابؒ بخششی صوفی کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔  
 ”صوفی کے دل کو کوئی چیز میلا نہیں کر سکتی، مگر اس سے ہر چیز کو صفائی  
 حاصل ہوتی ہے۔“

اس موضوع پر شیخ ابوالحسن بیروانیؒ نے الفاظ سے جادو گری کا کام لیا ہے اور  
 الفاظ کو اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ ہار میں شاید موتی بھی اس خوبصورتی سے نہ پرویا  
 جاسکے، الفاظ کی بندش اور بستگی بھی دیکھے اور حقیقت افزہ جملہ بھی پڑھیے۔  
 ”صوفی ولرواۃ کے ساتھ ہوتا ہے اور اد کے ساتھ نہیں۔“

حضرت شیخ ابوبکر محمد بن اسحاقؒ نے اپنی کتاب ”التعرف لمذہب اہل تصوف“  
 میں صوفی کے بارے میں صوفیاء کرام کی آراء و درج کی ہیں، کچھ اقوال روح کی تازگی اور  
 دل کی بالیدگی کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔

سب سے پہلے خود مولف کی رائے پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔  
 ”جو نہ کسی چیز کا مالک ہو اور نہ کوئی اس کا مالک، بالفاظ دیگر یہ کہ دینیوی  
 حرم و طبع نے اسے اپنا غلام نہ بنا رکھا ہو۔“

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

”صوفی وہ ہے جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اور اگر مالک بنے تو اسے زور کر ڈالے۔“

حضرت ابو یعقوب سوسی کی نظر میں صوفی کا کیا مقام ہے؟  
”صوفی وہ ہے جو کسی چیز کے چمن جانے سے بے قرار نہ ہو اور نہ کسی چیز میں اپنے آپ کو تھکائے۔“

حضرت شیخ سہل بن عبداللہ ترمذی سے دریافت کیا گیا۔ صوفی کون ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا:-

”جو ہر قسم کی میل کھیل سے پاک ہو، ہمہ تن غور و فکر ہو، مخلوق کو چھوڑ کر اللہ ہی کا ہو گیا ہو اور اس کے نزدیک سونے کی ڈلی اور مٹی کا ڈھیلا یکساں اہمیت رکھتا ہو۔“

حضرت داتا، ذوالنون مصری کی رائے کو نقل کرتے ہیں:-

”الصوفی اذا نطق بان لفظه، عن المعاني وان سكت، نطقت عنه الجوارح بقطع العلائق (اس کی گفتگو حقیقت کی ترجمان ہو اور اس کی خاموشی عوائق و علائق دنیا سے بیزاری کی علامت ہو)۔“

ہمارا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کہ تصوف اعلیٰ اخلاق اور صوفی کریم النفس افراد کا نام ہے اور بلند اخلاقی اور کریم نفسی اسلام کالب لباب اور عطر ہے، اسکی تفصیل آپ کو آئندہ صفحات میں ملے گی۔ فی الحال شیخ عبدالواحد بن زید کا قول ملاحظہ کیجئے،  
موصوف دوسری صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔

”صوفی وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل کے ذریعے سنت نبوی اور تہ دل سے اس پر عمل کرتے ہیں۔“



# شریعت اور طریقت

تصوف اور صوفیاء پر منجملہ دیگر الزامات کے یہ الزام بھی بڑی شدت کے ساتھ عائد کیا جاتا ہے کہ اہل تصوف کے ہاں شریعت اور طریقت میں تنویث پائی جاتی ہے۔ حلقہ تصوف میں زیادہ زور ظاہر کی نسبت باطن پر دیا جاتا ہے، گویا معتزضین کے نزدیک ظاہر سے مراد شریعت اور باطن سے مراد طریقت ہے، حالانکہ بذات خود یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ متصوفین کے ہاں شرعی حدود و قیود کی مناسب پاسداری نہیں کی جاتی، بلکہ بعض حضرات تو یہ بھی کہہ ڈالتے ہیں کہ ان کے ہاں ایک وقت احکام شریعت موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس الزام میں حقیقت ناشناسی اور مخصوص سوچ کا عنصر کار فرما ہے، ورنہ قدیم و حلیل صوفیاء کرام اور ان کی بلند پایہ تصنیف کے جائزے اور مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت و طریقت میں مخالف و تضاد اور افضل و معقول کی بحث تو کجا ان میں کسی درجے کی تقسیم و تفریق کا مشابہت تک نہیں ملتا، جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے:

”جو صوفی شریعت اور طریقت میں فرق کرے وہ صوفی نہیں بلکہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتا ہے۔“

شیخ موصوف ایک اور مقام پر قسطنطنیہ میں۔

”یہ خیال بڑا ہی ناچختہ ہے کہ ہم طریق تصوف کو شریعت اور قرآن و سنت کے مخالف سمجھنے لگیں۔ عاशा و کلا ان دونوں چیزوں میں کوئی مغایرت

یا اختلاف نہیں ہے“ سہ

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

”یہ لوگ (صوفیاء کرام) کتاب و سنت کے عامل تھے اور شریعت و طریقت کی تمام ظاہری و باطنی حدود کا احترام کرتے تھے، انہوں نے کبھی ظاہری شریعت اور باطنی شریعت میں تغافل یا تساہل سے کام نہیں لیا۔“ سہ

یہ نظریہ محض شیخ محقق گاہی نہیں، بلکہ تصوف کی ہزاروں کتابوں کا محض اور نچوڑ ہی ہے بلکہ یہ تو ایوان تصوف کا سنگِ بنیاد ہے۔ لاکھوں صفحات پر پھیلے تصوف کے سڑیچر کو کنگال جائیے، سب کا لب لباب یہ الفاظ بنیں گے۔

”ہماری طریقت کی بنیادیں کتاب و سنت پر ہیں، جو ان کی مخالفت کرتا

ہے ہمارے نزدیک وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور ہم اسے منکر

احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں اگر ذکر الہی، نماز، تلاوت قرآن

پاک میں ذوق، حضوری قلب اور ششوع حضور حاصل ہو تو فتح الباب

کی امید رکھنی چاہیے اگر یہ چیزیں حاصل نہیں تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو شخص

قرآن و حدیث پر غور نہیں کرتا اور علماء و فقہاء کی صحبت سے دور رہتا

ہے وہ بے ادب ہے اور تباہ و برباد ہوگا۔“ (ماخوذ از مرجع البحرین)

اگر انصاف، علمی دیانت اور ذہنی تکلف کے بغیر تصوف کی اہمات کتب کا مطالعہ

کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ارباب طریقت کے ہاں شرعی حدود کی پابندی کا احساس او

جذبہ ملے گا بلکہ شریعت تمام تراحوال و اعمال کا منبع و مصدر نظر آئے گی اور یہ تاثر برہنی

پوری گہرائی کے ساتھ محسوس ہوگا کہ شرعی حدود و احکام کی پابندی کے بغیر کوئی شخص

اپنے نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ کر ہی نہیں سکتا۔ حضرت ابو عثمان حیرمیؒ تو یہاں

نہم فرما چکے ہیں :-

تو میرے بیٹے اظہار میں سنت کے خلاف کرنا باطن میں ریاکاری  
کی علامت ہے :-

صوفیاء کرام کے ہاں کمالات ولایت اور مدارج طریقت میں مہلیوں کی طرح  
سمندر میں تیرنا اور پرندوں کی مانند فضاؤں میں اڑنا شامل نہیں بلکہ خالصتاً قرآن و  
سنت کی تابعداری اور پیروی اصل و اساس ولایت ہے، اس ضمن میں شیخ بایزید  
بسطامی کا قول دلیل قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

”اگر تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اسے کرامات دی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں  
اڑتا ہو پھر بھی تم اس سے دھوکا نہ کھانا۔ یہاں تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ وہ  
اوامر و نواہی کی پابندی، حدود اللہ کی محافظت اور شریعت کو پاسداری  
میں کیسا ہے :-“

جس طریقت کی بنیاد شریعت پر نہیں ایسی طریقت کے بارے میں صوفیاء کرام کی  
کیا رائے ہے؟ ملاحظہ ہو شیخ ابوسعید خراز کا ایک قول، جسے امام ابوالقاسم قشیریؒ  
نے اپنے ہاں بڑے اہتمام سے نقل کیا ہے :-

”ہر وہ باطن (طریقت) جو ظاہر (شریعت) کے خلاف ہو باطل ہے :-“  
اگرچہ یہ قول اس موضوع پر حرفِ آخر ہے مگر صوفیاء تو پاسداری شریعت کا  
اس درجہ خیال رکھتے ہیں کہ جو شخص شریعت کی حدود کو نظر انداز کر کے طریقت کا مدعی  
ہے یا طریقت کی آڑ میں اپنے آپ کو احکام شرعیہ میں مرفوع قرار دیتا ہے اسے صوفی  
وزاہد سمجھتا تو درکنار جہنم کا ایندھن تصور کرتے ہیں، تاہم اید کے لیے شیخ ابوالقاسم دمشقیؒ کی  
ایک روایت نقل کی جاتی ہے جو انہوں نے شیخ ابوعلی رودباریؒ سے کی ہے :-  
”کسی نے شیخ ابوعلی احمد سے ایک شخص کے متعلق پوچھا جو مزار میر سنستا

ہے اور پھر کہتا ہے کہ یہ تو میرے لیے جائز ہے کیونکہ میں ایسے مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ اب مجھ پر حالات کے اختلاف کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس پر شیخ نے فرمایا ہاں پہنچ تو چکا ہے مگر حتم میں نہ

صوفیاء کرام کے ہاں اگر شریعت و طریقت کے نام کی دو اصطلاحیں ملتی ہیں تو صرف اس انداز میں کہ اعضاء و جوارح سے احکام کی بجا آوری شریعت اور اس میں انحصار روح کا پیدا کرنا طریقت ہے۔ ظاہر ہے احکام پر عمل درآمد ہوگا، تو اخلاص بھی ہوگا۔ اس سے عمل ہی نہ ہو تو کاہل ہے کا اخلاص اور کیسی روح؟ یہاں پھر بھی شریعت مقدم رہی اس مسئلہ کو شیخ نجفی امیر نے اپنے ایک مکتوب میں بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے، لکھتے ہیں:-

”طریقت کی راہ بھی اسی شریعت سے نکلی ہے، شریعت و طریقت میں جو فرق ہے اس کو ہم بیان کرتے ہیں تم اسی سے سمجھتے جاؤ، شریعت میں توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ اور دوسرے احکام و شرائع اور معاملات ضروری کا بیان ہے، طریقت کہتی ہے کہ ان معاملات کی حقیقت دریافت کرو، ان مشروعات کی تہ تک پہنچو، اعمال کو قلبی صفائی سے آراستہ کرو، اخلاق کو نفسانی کدورتوں سے پاک کرو، جیسے ریاکاری ہے، ہوائے نفسانی ہے، ظلم و جفا ہے، کفر و شرک ہے، اچھا اس طرح نہ سمجھے ہو تو یوں سمجھو، ظاہری طہارت اور ظاہری تہذیب سے جس امر کو تعلق ہے وہ شریعت ہے، تزکیہ باطن اور تصفیہ قلب سے جس کو لگاؤ ہے وہ طریقت ہے، کپڑے دھو کر ایسا پاک بنا لینا کہ اس کو پہن کر نماز پڑھ سکیں، یہ فعل شریعت ہے اور دل کو پاک رکھنا کدورت بشری سے یہ فعل طریقت ہے، ہر نماز کے لیے وضو کرنے کو فعل شریعت

سمجھو اور ہمیشہ با وضو رہنے کو طریقت کا دستور العمل تصور کرو، نماز میں قبلہ رو کھڑے ہونا شریعت ہے اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہونا طریقت ہے۔ جو اس ظاہری سے جن معاملات کا دینی تعلق ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھنا شریعت ہے اور جن معاملات دینی کو قلب روح سے تعلق ہے اس کی رعایت کرنا طریقت ہے۔

مکتوب کے اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا اب قارئین کا کام ہے کہ اس میں کہاں شریعت کو نظر انداز کیا یا غیر ضروری قرار دیا گیا ہے، جو کچھ طریقت کے ذیل میں کہا گیا ہے اسے جو بھی نام دیا جائے بہر حال یہ تعلق شریعت کے بھی ہیں اگر یہ تقسیم برقرار رکھی بھی جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ جسم و روح والی بات ہے جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اسی طرح شریعت و طریقت کو ایک دوسرے کے لیے ناگزیر کہا جائے تو کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی یہی بات شیخ عبداللہ انصاری نے اپنے انداز میں کہی ہے۔

”ہر چند کہ شریعت سر بسر حقیقت ہے اور حقیقت تمام شریعت، حقیقت کی بنیاد شریعت ہے، شریعت حقیقت کے بغیر اور حقیقت شریعت کے بغیر بے کار ہے اور عمل کرنے والے ان دو کے بغیر بے کار ہیں۔“

شریعت کو نظر انداز کر کے مراحل طریقت طے کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے بہ طریقت کے میدان میں قدم رکھنے کا بہترین وسیلہ کیا ہے؟ اسے مؤثر اور دلنشین پیرائے میں شیخ محی شرف الدین مینیری واضح فرماتے ہیں، ان کے طویل مکتوب کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:-

”براہ و عزیزا شریعت کے بغیر طریقت کا قصد کرنا ویسا ہی ہے کہ ایک شخص کو ٹھے پر جانا چاہیے تو بیڑی کو توڑ ڈالے اور دیوار پکڑ کر اوپر چڑھے

نتیجہ یہ ہوگا کہ دو چار ہاتھ بہ مشکل اوپر جائے گا پھر پھسل پھسل کر گرے گا۔ یا یوں سمجھو کہ ایک شخص کو یہ خط سامنے کہ ہم پتھر ایسا اچھال سکتے ہیں کہ نظر سے غائب ہو جائے ہزار ہزار زور لگائے گا، کوشش کا خاتمہ کر دے گا ناکامیاب رہے گا بہ مشکل اچھالے گا، دم سے آتا رہے گا بغیر شریعت جسم خاکی پتھر سے بدتر ہے وہ شخص فضائے طریقت میں اڑ نہیں سکتا یہ کوشش لامعاصل ہوگی۔ ۱۰

انہی شیخ موصوف کے یہ الفاظ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔  
”ولی صادق وہی کہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جو نبی چاہتا ہے۔“ ۱۱

اس بحث کے ضمن میں یہ بات بھی بالعموم سنی اور پریمی جاتی ہے کہ صوفیا کرام کا اکثر بیشتر انحصار ذوق، کیفیت کشف اور اس طرح کے دیگر احوال پر ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یوں نہیں، کیونکہ جس طرح زندگی کے دوسرے امور و مسائل کی عنان ذوق و کیفیت ہاتھ میں نہیں دی جاسکتی تو مسائل تصوف میں یہ کیسے بار پائے؟ یہ الگ بات ہے، کہ اس جذبے اور ذوق کی قرآن و سنت سے تائید ہوتی ہو پھر اسے ضرور سند کا درجہ ملنا چاہیے اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو مشہور صوفی بلکہ امام الاصفیاء شیخ اسماعیل بن عبدالقادر سمریؒ کا فیصلہ صدیوں پیشتر تاریخ میں محفوظ ہے۔

”ہر وہ جذبہ اور وجدانی کیفیت جس کی شہادت کتاب و سنت سے نہ ملے باطل ہے۔“ ۱۲

یہی بات بغیر الفاظ شیخ جنید بغدادیؒ کے ہاں نظر آتی ہے۔

”ہمارا مذہب (تصوف) کتاب و سنت کے اصولوں کا پابند ہے۔“ ۱۳

صوفیاء کرام شرع شریف کے معاملہ میں علماء و علما ہر سے کسی صورت کم حساس نہیں، صوفیاء کرام کے ہاں شریعت سے ہٹ کر کوئی عمل کرنا، شریعت کے حوالے کے بغیر کوئی

بات سننا، کسی ایسی مجلس کا اہتمام یا اس مجلس میں شرکت جہاں شریعت کو ملحوظ رکھے بغیر گفتگو ہوتی ہو عد درجہ خطرناک اور مہلک ہے جو شخص قرآن و سنت سے الگ کسی بات کا دعویٰ کرتا ہے۔ اُس کا صوفی یا صاحبِ طریقت ہونا تو محال ہے ہی اس کی صحبت اختیار کرنا ایک خطرہ عظیم سے کم نہیں۔ حزم و احتیاط کی راہ میں ہمارے لیے شیخ ابوالحسین احمد نوریؒ کا فرمان مشعل کا کام دیتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

”جس شخص کو تو اللہ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتے ہوئے دیکھے جو اسے شریعت کی حد سے نکال دے تو تجھے اس شخص کے قریب بھی نہیں پھلکنا چاہیے۔“ ۱۴

شیخ جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں :-

”چونکہ ہمارا (صوفی) معرفت کتاب و سنت کا پابند ہے اس لیے جس شخص نے نہ قرآن حفظ کیا ہو اور نہ حدیث لکھی ہو، راہِ طریقت میں اس کی پیروی نہ کی جائے گی۔“ ۱۵

اگر کوئی شخص صوفیاء کرام کی ان تصریحات کے بعد بھی کسی قرآن و سنت کی راہ سے بٹ کر چلنے والے کو صوفی یا ولی کہتا ہے تو یہ سراسر ناانصافی ہے کیونکہ صوفیاء آپس میں پیچ کر تارک کتاب و سنت کے بارے میں کہہ رہے ہیں :-

”جو شخص ہر وقت اپنے افعال کو کتاب و سنت کی میزان میں نہ تولتا ہو ہم اسے ”دیوانِ رجال“ میں شمار نہیں کرتے۔“ ۱۶

ضمناً اس اعتراض کا جائزہ بھی لے لینا چاہیے کہ صوفیوں کے ہاں علم کی بڑی کمی ہوتی ہے اور منازلِ سلوک طے کرنے کے لیے علم کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا یہ اعتراض بھی محض برائے اعتراض ہے۔ واقعہ میں بالکل ایسا نہیں۔ اگر صوفیاء کرام کی تعلیمات کو بغور اور تفصیل پڑھا جائے تو ان کی علمی گہرائی، نکتہ بینی، ذہانت و فطانت اور مطالعاتی

ذوق کا معترف ہونا پڑتا ہے، صوفیاء کرام کے نزدیک وہ شخص صاحبِ رشد و ہدایت نہیں ہو سکتا جو علوم شرعیہ کا معتبر عالم نہ ہو۔ بابا فرید الدین گنج شکر فرمایا کرتے تھے:

”جاہل پیر، سحرہ شیطان ہوتا ہے۔“

شیخ جنید بغدادی اپنے بارے میں لکھتے ہیں:-

”میں نے پہلے علم حدیث اور فقہ حاصل کیا۔ اس کے بعد شیخ عارف الحامی

صاحب کتاب الرعایہ کی صحبت اٹھائی اور یہی میری کامیابی کا راز ہے کیونکہ

علم تصوف کو قرآن کے تابع رہنا چاہیے جس نے تصوف سے پہلے قرآن

مجید حفظ نہ کیا ہو (یا نہ پڑھا ہو) اور حدیث میں سند حاصل نہ کی ہو، اُسے

دوسروں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں۔“

شیخ سری سقطیؒ نے جو شیخ جنید بغدادیؒ کے ماموں بھی ہیں اور مرشد فیض بھی،

جنید بغدادیؒ کو دعا دی۔

”خدا تمہیں ایسا محدث بنائے جو علم تصوف سے بھی آگاہ ہو یا پھر ایسا صوفی

جو علم حدیث سے بھی آشنا ہو۔“

اس دعا میں صراحتاً محدث بننے کو مقصود ہونے پر ترجیح حاصل ہے جو لفظ نظام الدین

اولیاء شیخ طریقت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

پیر ایسا ہونا چاہیے کہ احکام شریعت، طریقت، اور حقیقت کا علم رکھتا ہو اگر

ایسا ہو گا تو خود کسی نامشروع چیز کے لیے نہ کہے گا۔“

اس ضمنی بحث کو ہمیں ختم کر کے ہم دوبارہ اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں، کسی

شخص کا ذوق اور وجدان جس طرح شریعت میں ناقابل قبول ہے، اسی طرح طریقت میں

بھی اس امر کا خاطر خواہ لحاظ کیا جاتا ہے۔ طریقت کے ہر نکتے کی شریعت مطہرہ سے تائید

مردوری سمجھی جاتی ہے اور جملہ ارباب طریقت نے طریقت پر شریعت کو نگہبان بنایا ہوا



ہے، اور صرف آغاز شریعت ہی کو قرار دیا جاتا ہے، شیخ ابوسلیمان عبد الرحمان دارانیؒ فرماتے ہیں:-

”بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میرے دل پر صوفیاء کے نکاتِ معرفت وارد ہوتے ہیں اور کئی دنوں تک رہتے ہیں مگر جب تک کتاب و سنت، دونوں عادل گواہ انہیں قبول نہ کریں میں انہیں قبول نہیں کرتا۔“

اب ہم اس بحث کو سمیٹتے ہوئے آخسر میں شیخ شہاب الدین سروردیؒ کا ایک قول نقل کرتے ہیں۔ اور نہ اس موضوع پر بزرگانِ دین اور صوفیاء کرام کے اقوال کا ایک انبار لگایا جاسکتا ہے، لیکن ذہن صاف اور آنکھ زنگین شیشہ سے پاک ہوتو ایک ہی حوالہ آمامِ حجت کے لیے کافی ہے۔

شیخ شہاب الدین سروردیؒ رقم طراز ہیں:-

”کچھ فتنہ کے مارے ہوؤں نے صوفیوں کا لباس پہن لیا ہے کہ صوفی کہلائیں حالانکہ ان کو صوفیاء سے کچھ علاقہ نہیں۔ بلکہ وہ مغرور غلط ہیں مبتلا ہیں، جکتے ہیں کہ ان کے دل خالص خدا کی طرف مبتلا ہو گئے اور یہی مراد کو پہنچ جانا ہے اور رسومِ شریعت کی پابندی عوام کا مرتبہ ہے۔ ان کا یہ قول خالص الہاد اور زندقہ ہے اس لیے کہ جس حقیقت کو شریعت ذکر سے وہ حقیقت نہیں بے دینی ہے۔“

اس قدر مدلل بحث، واضح اقوال اور مستند آراء پیش کرنے کے بعد سرسبز تہجد اور بے رحمانہ تجاہل ہو گا اگر کچھ بھی یہ الزام تصوف اور اہل تصوف کے سر تھوپا جائے کہ ان کے ہاں شریعت اور طریقت میں امتیاز و تفریق ہے اور شریعت کے قواعد و ضوابط کو مد نظر نہیں رکھا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف جہاں مذہب کی روح، اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال ہے وہاں اس کی اساس شریعت مطہرہ اور اس کا سرچشمہ، قرآن و حدیث ہے۔

# کشف و کرامت

بالعموم تصوف اور صوفیاء کا ذکر آتے ہی ذہن شب و روز کے اور ادو وظائف ، چلوں ، مراقبوں ، تسبیح گردانی اور حق ہو کی ضرب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، صوفیاء انہیں سمجھا جاتا ہے جن کے ہاتھوں دن رات عجائب و غرائب اور محیر العقول واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے، انکشافات کا دور دورہ ہوتا ہے، غیب کی خبریں آئندہ کے حالات اور ہوشربا کمالات انسان کو درطہ حیرت میں ڈالے رکھتے ہیں، یہ لوگ کبھی سمند میں مصلے سے کشتی کا کام لیتے ہیں، کبھی بیٹھے بیٹھے دنیا کی سیر کرتے ہیں کبھی ذرا جہنم کی اور فضاؤں میں اڑنا شروع کر دیتے ہیں یہ اور اس قسم کے طلسماتی تھنے مشہور و معروف ہیں۔ اس قسم کی رائے قائم ہو جانے کی دو وجوہ ہیں۔ اولاً تصوف اور ارباب تصوف کے خلاف پروپیگنڈہ والستہ اور نادانستہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ تصوف و اہل تصوف کو کشف و کرامت کے حوالے کے بغیر پہچانا بھی نہیں جاسکتا۔ ثانیاً جب سے تصوف بحیثیت ادارہ کے اپنی غایت حقیقی اور عرض اصلی سے ہٹا ہے اور سمند تصوف کے وارث اپنا مقصود مجھلا بیٹھے تو اقبالؒ کے الفاظ میں اس کے علاوہ کیا رہ جاتا تھا؟

۷ رہا نہ حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی فسانہ ہائے کلمات رہ گئے باقی  
ورنہ ذرا سنجیدہ نظری اور اخلاص نیت کے ساتھ تصوف کی اہمات کتب اور

صوفیاء کرام کی تیر و سوانح کو پڑھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ تصوف محض کشف و کرامت یا اور ادو و ظالمت کا ارادہ نہیں بلکہ ایک عالمگیر تحریک ہے۔ ایسا سانچہ جس میں انسان ڈھالے جاتے ہیں، ایسی بھٹی جہاں سے انسان کندن بن کر نکلتے ہیں، تصوف ایک ایسا ادارہ ہے جہاں تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کا انتظام ہے جہاں "تخلقوا باخلاق اللہ" کی عملی تفسیر پڑھائی جاتی ہے، جو ملکیت اور امریت کے خلاف مضبوط مورچہ ہے، جہاں دکھی اور چین، سکون کو ترستی دنیا کے لیے سکون کا سامان ملتا ہے، جہاں ہر شخص اپنی انسانیت اور غیرت نفس کا بچشم خود مشاہدہ کرتا ہے جہاں ذات پات اور نیوی تفریق کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ جہاں ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھا ایک پیمانے سے پرکھا ایک کسوٹی سے جانچا، ایک معیار پر رکھا اور ایک میزان میں تول جاتا ہے، جہاں سوائے ذکر النبی اور خدا خونی کے کسی مناظرہ اور مباحثہ کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ جہاں قلب و نظر میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے، جہاں علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ یقین پیدا کیا جاتا ہے۔ جہاں نفرت کے بجائے محبت کے زمرے بنتے ہیں جہاں الجھنے کے بجائے سلجھنا سکھایا جاتا ہے جہاں دماغ کو ریز آگاہ اور دل کو سوز آشنا بنایا جاتا ہے، جہاں راکھ کے ڈھیر میں دبی چنگاری کو شعلہ بدایا گیا جاتا ہے، جہاں رنگت مخلوق کو ہوا بدوش بنایا جاتا ہے، رہا کشف و کرامت کا مسئلہ تو اُسے نہ پہلے اہمیت حاصل تھی نہ اب ہے، ظاہر ہے جب نا اہل منصب قضا، سنبھال لیں اور قلم غدار کے ہاتھ میں ہو تو۔

مظہر منصور بردار سے بود

ایسا ہی المیہ تصوف کے ساتھ ہوا ہے، غیر تاک میں تھے، اپنوں نے موقع مہیا کر دیا اور روتے پر روتے چڑھتے گئے، ورنہ کہاں تصوف اور کہاں کشف و کرامات کے چرچے؛ اولیاء کرام کے ہاتھوں کرامات ظاہر ضرور ہوئیں، اجمیر کے سنیا سی اور

جوگی کا مقابلہ اس کے بغیر ممکن نہ تھا بعد میں بننے والے شیخ ہندی سے اسی طرح مطالبہ  
سکتا تھا، فرعونی دربار میں رسیوں کا سحر عصائے موسیٰ ہی سے زائل کیا جاسکتا ہے۔  
جالینوس کے پیروؤں کا طبی طلسم "قوباذن اللہ" کہہ کر کوئی "مسح" ہی توڑ سکتا ہے۔  
لیکن اسی بات کو تصوف کی بنیاد سمجھ لینا صریح ناانصافی ہے۔

خواجہ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں :-

"سلوک کے سو درجے مقرر کیے گئے ہیں ان میں سترھواں درجہ کرامت ہے۔

اگر سالک اسی درجے میں رہ جائے تو وہ باقی کے ترسی درجوں تک کیسے پہنچے گا؟  
صوفیاء کرام کی تبلیغی کوششوں کا ہم انشاء اللہ اگلے صفحات میں بھرپور جائزہ لیں  
گے تو ثابت ہو جائے گا کہ صوفیاء نے کشف و کرامت کے ذریعے دنیا میں کام نہیں کیا  
بلکہ ایک مجاہد کی سی شان کے ساتھ جھونپڑوں سے ایوانوں اور گلہ بانوں سے لے کر  
جہاں بانوں تک پہنچے اور تبلیغ و وعظ کا حق ادا کیا کیونکہ تصوف پر اپنٹریت ہی تو ہے، جو احکام  
شرعیہ کے وہی تصوف کے اور جو ذمہ داریاں اہل شرع کی وہی ذمہ داریاں اہل تصوف  
کی ہیں، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں :-

"خواجہ عبید اللہ احرار فرمایا کرتے تھے اگر میں صرف پیری مریدی کروں تو

کسی بھی پیر اور شیخ کو جہاں میں مرید میر نہ آسکے سب کو میں اپنی ہی طرف

کھینچ لوں، مگر میرے ذمہ دوسرا کام لگا یا گیا ہے وہ ہے شریعت کی ترویج

اسلام کی تائید، اس بنا پر آپ کے پاس تشریف لے جاتے اور

اپنے تصرف سے ان کو اپنا مطیع بناتے اور اس ذریعہ سے شریعت حقہ

کی ترویج فرماتے۔" لہذا

سچی بات یہ کہ تصوف میں کشف و کرامت کا اعتبار نہیں بلکہ ایمان کی خشکی اور

اعمال و احوال کی درستگی کا چلن ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

”والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ نکتہ حضرت حافظ (سید عبداللہ) سے  
کئی بار سنا کہ ”کشف برکشف“ کشف کے سر پر جو نام یعنی صوفیاء کے نزدیک  
استقامت معتبر ہے نہ کہ کرامت“۔

شریعت و طریقت کے عنوان میں ہم حضرت بایزید بسطامیؒ کا یہ قول پہلے بھی نقل  
کرائے ہیں مگر موضوع کی مناسبت اور قول کی اہمیت کے پیش نظر مذکورہ کے طور پر  
اسے دوبارہ پڑھ لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

”اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اُسے کرامات عطا کی گئی ہیں حتیٰ کہ وہ ہوا میں اڑتا  
ہے تو اس سے دھوکا مت کھاؤ۔ جب تک کہ یہ نزدیک لو کہ وہ اوامرو  
نواہی کی رعایت، حدود اللہ کی محافظت اور آدابِ شریعت کی پیروی  
میں کیسا ہے؟“

اگر ابتدائی دور میں تصوف پر جبکہ وہ عالم شباب میں تھا نگاہ ڈالیں تو جوں جوں  
آپ اوپر جائیں گے کرامات اتنی ہی کم نظر آئیں گی، بلکہ زیادہ سے زیادہ مزہ اصلاح اعمال  
و اخلاق ہی نظر آئے گا، کیونکہ علم و عمل کی قوت سے ہی سرکش ذہن اور باغی دل مسخر  
کیے جاسکتے ہیں جو کشش اور تاثیر اخلاق میں ہے وہ کشف و کرامت میں کہاں؟ اُس  
نے قدیم صوفیاء کرام کے حالات زندگی پر لکھی گئی کتابوں کا ایک ایک ورق الٹ پلٹ  
کر دیکھ لیجئے، کرامات ڈھونڈھے سے مشکل ہی ملیں گی۔ شیخ مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:-

”ظہورِ خوارق پر نظر رکھنا کوتاہ نظری ہے اور استعدادِ تقلیدی کم ہونے  
کی دلیل ہے، میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اکثر متقدمین سے بھی ساری عمریں پانچ  
چھ خوارق سے زیادہ کا ظہور نہیں ہوا۔ حضرت جنیدؒ جو اس گروہ کے سردار  
ہیں، معلوم نہیں اُن سے دس کرامات کا ظہور بھی منقول ہو“۔

بعض مستند صوفیاء کے نزدیک تو کرامت کو حیض الرجال سے تعبیر کیا گیا ہے،

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا مشہور قول ہے۔

”عزم ایماں باید خورد، در پے کرامت نباید بود۔“

یہ تاثر جب سے قائم ہوا ہے اُس دن سے کسی ولی کی ولایت کا معیار صرف اور صرف کرامت ہی رہ گیا ہے، جس سے جتنی زیادہ کرامتیں منسوب ہوں گی، وہ اتنا ہی زیادہ باخدا بزرگ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ”اعلمکم و اتقاکم“ کی جو قید شریعت میں ہے وہی تصوف میں بھی ہے۔ جسے دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس بات کو ایک حکایت کے ذریعے شیخ سیف الدین جمویہ نے بڑی خوبصورتی اور عمدگی سے واضح فرمایا ہے، خواجہ نظام الدین اولیاء ان سے روایت کرتے ہیں۔

شیخ سعد الدین جمویہ ایک مرد بزرگ تھے اگر شہر کا والی ان سے عقیدت نہیں رکھتا تھا ایک دن ایسا ہوا کہ والی شہر شیخ کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچا..... آپ نے خوشی کا اظہار کیا چنانچہ دونوں اکٹھے بیٹھ گئے پاس ہی ایک باغیچہ تھا شیخ نے وہاں سے کچھ سیب لانے کا اشارہ کیا چنانچہ جب سیب لائے گئے شیخ نے اسے کھایا، سامنے پڑی ہوئی طشتری میں ایک موٹا سیب دھرا تھا۔ والی کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر شیخ کرامت اور صفائی باطن کے مالک ہیں تو یہ موٹا سیب مجھے دیدیں۔ جیسے ہی والی کے دل میں یہ خیال آیا شیخ نے ہاتھ بڑھایا اس سیب کو اٹھایا اور والی کی طرف منہ کر کے کہا ایک دفعہ میں سفر میں تھا، دوران سفر ایک شہر میں پہنچا۔ شہر کے دروازے پر پھیر لگی تھی ایک بازمی گر کر تباہ کھا رہا تھا۔ اس بازمی گر کے پاس ایک گدھا تھا۔ اُس نے کپڑے سے گدھے کی آنکھیں باندھ رکھی تھیں، اس اثنا میں اس نے ہاتھ میں ایک انگشتری لی اور وہ انگشتری تماشائیوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں ڈال دی۔ اس وقت بازمی گر لوگوں کی طرف

متوجہ ہوا اور کہا جس کے ہاتھ میں انگٹری ہے گدھا اُسے ڈھونڈ لکالے گا اس پر وہ گدھا اس مجمع کے اندر چکر لگانے لگا اور اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، وہ ہر ایک کو سونگھتا سونگھتا اس آدمی کے پاس پہنچ گیا، گدھا وہاں کھڑا رہا۔ بازی گر آیا اور اس نے اس آدمی سے انگٹری لے لی، اس حکایت کو بیان کرنے کے بعد شیخ حمویہ نے والی شہر سے کہا اگر کوئی شخص اپنے کشف اور کرامت کا ذکر کرتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو اسس بازی گر کے گدھے کے درجے پر رکھتا ہے۔ اگر وہ اس بارے میں کچھ نہیں کہتا تو تمہارے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ اس شخص میں صفائی باطن نہیں، شیخ نے یہ فرمایا اور سیب والی شہر کے سامنے رکھ دیا۔

اس واقعہ میں تین باتیں واضح ہوئیں :-

اولاً :- وہ ذہنیت جو کرامت کو اساس ولایت جانتی اور مانتی ہے۔

ثانیاً :- کرامت صوفیاء کے نزدیک کس درجے کی چیز ہے؟

ثالثاً :- کرامت ظاہر ہو بھی تو اس سے مقصود کیا ہوتا ہے؟

اس ساری بحث سے پتہ چلا کہ صوفیاء کی محافل و مجالس خوارق سے معمور نہیں ہوتیں بلکہ ان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ غم روزگار میں الجھا ہوا افسردگیوں اور مایوسیوں میں لپٹا ہوا محرومیوں سے سمٹا ہوا، حادثاتِ زمانہ میں گھرا ہوا کوئی شخص جب انکی محفل میں جاتا تو ایک بار اُسے یوں لگتا جیسے اُس کے ذہن سے غم کا ایک ایک کانٹا نکال لیا گیا ہے، اب کوئی کھٹک اس کے دل میں اور کوئی پھانس اس کے حلق میں نہیں رہی اس لیے کہ اطمینان قلب کا اصل ذریعہ ذکر اللہ ہے اور یہی جنس ”وکان تصوف پر“ ”ارزاں“ ہے۔

۷

شعبدوں اور عجولوں کی دنیا کا تزکیہ و تصفیہ کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں اسی لیے  
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں :-

• امیر ابو العلاء فرمایا کرتے تھے، اگر کوئی شخص ہماری مجلس میں اس صحرا  
نورد کی طرح سکون محسوس کرتا ہے جو انتہائی گرمی کے موسم میں کسی  
درخت کے سائے میں پہنچ کر اپنے تن بدن کی راحت محسوس کرتا ہے  
تو اسے ہماری صحبت مبارک ورنہ وہ دوسری جگہ چلا جائے کیوں کہ ہمارے  
ہاں کشف و کرامت کی دنیا نہیں بلکہ عالم الوندی ہے۔

<http://t.me/Tehqiqat>



# تصوّف۔ اہمات کتب

تصوّف۔ اہمات تصوّف کے بارہ میں پیدا شدہ غلطیوں کے اسباب میں ایک اہم سبب مطالعہ کرنے والوں کی سہل انگاری کو قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ غیروں نے جان بوجھ کر اپنے مطلب کے لیے وہ تحریریں اخذ کر لیں جو ان کے لیے مفید اور تصوّف کے خلاف بطور ہتھیار استعمال ہو سکتی تھیں۔ اگر یہ انداز تحقیق کے معیار پر پورا اترتا ہے تو اسے اپنا کر کسی بھی کتاب کے بارے میں غلط رائے قائم کی جاسکتی اور غلط تاثر دیا جاسکتا ہے، اور اس سے الہامی کتابیں بھی شائد محفوظ رہ سکیں، جیسا کہ ستیا رتھ پرکاش میں قرآن مجید پر تبصرہ کیا گیا ہے، پس منظر کو نظر انداز کر کے کسی واقعہ کا بیان، مجموعی مزاج سے صرف نظر کر کے یک رخا مطالعہ، خذ ماصفا کے اصول کو پس پشت ڈال کر کمزور باتوں کا تعاقب اگر ایسے ہی منفی نتائج پیدا نہ کرے گا تو اور کیا ہوگا؟ کسی موضوع پر تحقیق سے پہلے اس کے متعلق ایک مخصوص نظریہ قائم کر لینے، خاص زاویہ نظر اپنا لینے، اور دل میں سوؤ ظن پیدا کر لینے کا نتیجہ اس سے شائد ہی مختلف نکلا ہو، ہر بات پر گرفت کرنا، ہر کمزوری پر نظر رکھنا، اور ہر لفظ سے غلط مطلب نکالنا، جب اپنے لیے فرض قرار دے لیا جائے تو زیر بحث موضوع کا کلیہ بگڑے گا یا نہیں؟ اپنے بھی اس کو تا ہی میں برابر کے شریک اور حصّہ دار ہیں، انہوں نے اس عالمگیر اخلاقی، اصلاحی اور روحانی تحریک کا مطالعہ

کرتے ہوئے دماغ سوزی اور پتہ ماری سے کام لینے کی بجائے ہر سری نظر ڈالنا کافی سمجھا، تصوف کی اہمات کتب، ارباب تصوف کی مستند سوانح و سیر پڑھنے کی بجائے روایات و حکایات کے ناقابل اعتنا، مجموعوں اور غیر مستند ملفوظات و ارشادات کے پلندوں اور کرامات و حکایات سے بھرپور کتابوں کا مطالعہ اس موضوع کو سمجھنے کے لیے کافی جانا جو ہر اسرنا الصافی ہے، مجھے تصوف کے خلاف سینکڑوں کتابیں اور مقالات پڑھنے کا موقع ملا ہے لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کتابوں اور مقالات کے مولفین محترم نے ان کتابوں کو اپنا ماخذ و مرجع قرار دیا ہے جو خود ارباب تصوف کی نظروں میں یکسر ناقابل اعتماد ہیں اور کسی صوتی یا بزرگ نے اپنی تحریر میں ان کا حوالہ نہیں دیا، کسی کتاب کو صرف اس لیے قابل استناد جان لینا کہ اس کی تالیف و ترتیب کسی نامور بزرگ کے نام سے منسوب ہے، مدد درجہ ستم ظریفی ہے، کاش کہ ہم علمی ذمہ داری اور آخرت کی جوابدہی کا احساس کر کے اپنی رائے کا رخ متعین کرتے۔ مگر ایسا کیوں کرتے؟ اس کے لیے تو غیر معمولی محنت اور دیانت درکار تھی اور پھر وہیں ایک رائے قائم کر چکا تھا اب صرف رسے چڑھانے کی ضرورت تھی، سو اس کے لیے اہمات کتب کے بجائے ایسی ہی ناقابل اعتماد کتابیں معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ ملفوظات و ارشادات کے جو مجموعے چھپے ہوئے ہیں ان میں صرف "فوائد الفوائد" ہی ایک ایسا مجموعہ ملفوظات ہے جسے صوفیاء میں درجہ قبول حاصل ہے۔ یہ کتاب خواجہ نظام الدین دہلویؒ کے ملفوظات و ارشادات پر مشتمل ہے، اسے آپ کے رفیق و مرید خاص امیر حسن علاء بخاریؒ المعروف خواجہ حسن دہلویؒ نے مرتب کیا ہے، خواجہ حسن دہلویؒ کے ہم عصر اور پیر بھائی امیر خسرو کے الفاظ ہیں:-

کاش میری ساری کتابیں سن لے لیتے لیکن یہ کتاب فوائد الفوائد میرے قلم سے ہوتی۔

اس کے علاوہ ایک ضخیم مجموعہ "ہشت بہشت" کے نام سے چھپا ہوا ہے جس میں طغوظات کی آٹھ کتابیں جمع ہیں جو علی الترتیب خواجہ عثمان ہارونی کے طغوظات خواجہ معین الدین چشتی نے ترتیب دی ہیں خواجہ معین الدین چشتی کے ارشادات کو خواجہ بختیار کاکلی نے قلم بند کیا ہے، خواجہ بختیار کاکلی کی مجالس کی روداد خواجہ فرید الدین گنج شکر کے ہاتھوں جمع ہوئی ہے اور خواجہ فرید الدین کے اقوال کو خواجہ نظام الدین اولیاء نے مرتب کیا ہے اور یہ سلسلہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی اور خواجہ بدر الدین اسحاق ٹٹک چلتا ہے، یہ پورا مجموعہ اپنے مندرجات و مضامین کے اعتبار سے محل نظر ہے، اس میں انیس الارواح، افضل الفوائد، راحت العاشقین، فوائد السالکین، اور دلیل العارفين وغیر ہم رسالے شامل ہیں، اب اگر کوئی شخص محقق بن کر تصوف کی تعلیمات اور اباب تصوف کی بیرت پر تحقیق کے لیے ان رسالوں کو اپنا مرجع و ماخذ قرار دے لے اور لوگوں نے دیا ہے تو تحقیق کا جو شاہکار برآمد ہو گا وہ محتاج بیان نہیں، حالانکہ یہ وہ مجموعے اور رسائل ہیں جنہیں تصوف کے کسی عام حلقے میں بھی قبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ کجا کہ خواص انہیں پسند کرتے۔ کتاب "فوائد الفواد" اگر متصوفین کے ہاں مقبول و محبوب ٹھہری ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب واقعہً تعلیمات تصوف کی ترجمان ہے اور اس کے مندرجات کی مجموعی طور پر ذمہ داری لی جاسکتی ہے۔

یہاں ضمنی طور پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تصوف کے بارے میں غلط فہمیوں کی پیداوار میں ان کتابوں کا بھی خاصہ دخل عمل ہے جو عملی کے بجائے نظری تصوف کا ترجمان لیے ہوئے ہیں اور اسی مکتب فکر کی ترجمان ہیں جنہوں نے تصوف کو عملی تحریک اور روحانی انقلاب کے بجائے فلسفہ منطوق کی طرح ذہنی تعیش کا رنگ دے دیا ہے اور تصوف جو اپنی تعلیمات و افکار کے لحاظ سے کھرا، سادہ، پرمغز،

سہل اور قرآن و سنت کا خلاصہ تھا، اس میں فلسفیانہ ادق اصطلاحات، منطق کے پیچیدہ گنجلک قواعد اور علم کلام کی موٹنگانیاں اور نکتہ آرائیاں شامل کر دی گئیں جس سے تصوف عمل کی دنیا سے لکل کر قیل و قال کے حلقے میں داخل ہو گیا۔ عمل سے جلا وطن ہو کر دماغ کو اپنا مسکن بنا بیٹھا اور پھر اصلاح کی جگہ مناظرہ تعلیم کی جگہ مباحثہ، تلقین کی جگہ مجاہدہ، سوز و رول کی جگہ زبان کے چٹخارے اور روح کی تڑپ کی جگہ دماغ کے تعیش نے لے لی، نتیجہ یہ نکلا کہ معتولیوں اور فلسفیوں کے جامد و معطل، روح سے خالی، سوز و غماری مکتب کے مقابلے میں ارباب تصوف نے جو خالق ہیں تیار کی تھیں، ان میں پہنچ کر انسان مشین نہیں جذبات و احساسات کے قالب میں ڈھل جاتا تھا، جہاں جذب شوق کے چراغ جلتے تھے، جہاں کیفیت اور ذوق کی قندیلیں روشن تھیں اور جہاں مستی و سرشاری کے فالوس جگمگاتے تھے، رفت رفتہ بحث و مباحثہ اور چہنیں و چناں کا انداز لے لے کر مکتب کے ماحول میں ڈھلتی گئیں اور پھر مکتب و خاتقاہ میں نام کے تغیر اور چند قدموں کے فاصلے کے سوا کچھ فرق نہ رہا۔ روح بلالی نہ رہی مگر رسم اذان موجود، فلسفہ رہ گیا مگر تلقین غزالی مفقود، میرا اندازہ ہے، کہ ان کتابوں کو متعارف کرانے میں بھی اسی ذہن کا دامن چھتا ہے، جو تصوف کو ایک خاص رنگ میں دیکھنا اور لوگوں کو دکھانا چاہتا تھا اور نہ محققین کو چاہیے تھا کہ ایسی کتابوں کو خواص کے حلقوں میں محض تحقیق و تدقیق اور اضافہ معلومات کے لیے وقف کر دیتے، ان کی کسوٹی پر اصل تصوف کو پرکھنے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ حق یہ ہے کہ تصوف تو نام ہی عمل کا ہے، اس کا بحث و نظر سے کوئی تعلق نہیں، بحث و نظر مکتب و اہل مکتب کا مشغلہ ہے، تصوف کا آغاز عمل سے ہوتا ہے اور انجام اخلاص پر، تصوف کیا ہے؟ قرآن و سنت کے اتباع اور اتباع میں اخلاص کا دوسرا نام ہے، حضرت داتا گنج بخشؒ نے کشف المحجوب میں

شیخ ابوالحسن الفوسیحی (م: ۳۴۸ھ) کا ایک قول نقل کیا ہے کہ: آج کل تصوف نام ہے بغیر حقیقت کے لیکن زمانہ، سابق میں یہ ایک حقیقت تھی بغیر نام کے اور داتا گجوری اپنی طرف سے اضافہ کر کے کہتے ہیں :-

”سلف صالحین اور صحابہ کرام کے زمانہ میں یہ نام موجود نہ تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص میں جلوہ گر تھی“

کتنی حقیقت افروز بات لکھی ہے شیخ گجوریؒ نے، فی الواقع اگر تصوف کی اہمات کتب کا مطالعہ کیا جائے تو وہ قرآن و حدیث کی تفسیر میں اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ معلوم ہوتی ہیں، مگر عملی تصوف کی جگہ جب سے نظری تصوف نے لی تو مباحث کا دروازہ کھل گیا اور اصطلاحات کی ایک کھیپ تیار ہو گئی، چنانچہ جب ہم تصوف کی قدیم ترین اور اہمات کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے عنوانات و مباحث کچھ اس طرح ہیں، تقویٰ، اخلاص، صبر، شکر، توکل، توبہ، انابت، ثنوت، یقین، استقامت، خوف، رجا، رضا، فقر، تواضع وغیرہم اور پھر ان عنوانات کی وضاحت اور تشریح کی گئی ہے، قرآنی آیات، احادیث نبویؐ سے اور پھر ان کی متابعت یا مطابقت میں بزرگان دین کے اقوال جو بجائے خود آیات و احادیث کا عطر و خلاصہ ہوتے ہیں، لیکن جب نظری تصوف پر مشتمل مضامین کی حامل کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس طرح کے ابجاث و عنوانات قائم ہوتے نظر آتے ہیں، لواح، طوامح، لواح، تلوین، تمکین، تجلی، تختی، انزعاج، اصطلاح، رسم، رسم، معانی، ازلیہ، حقیقۃ الحقائق، قبض و بسط، علت و معلول، تنزیہ، تشبیہ، عینیت وغیرہم، اور عین ثابتہ اور عین خارجہ وغیرہم، ان اصطلاحات کا تعلق انسان کے اضافہ معلوماً ذخیرہ الفاظ، جودت، طبع، رسائی، فکر، سلاست، بیان اور طلاقت تحریر سے تو ہو سکتا ہے مگر اس کے اخلاق، روحانیت، اور اعمال سے ہرگز نہیں ہو سکتا، اس لیے چلیے

تھا کہ ان بحثوں کو چہار دیواری کے اندر رکھا جاتا اور یہ صغریٰ کبرے صرف مکتب ہی میں ملائے جاتے، افسوس ایسا نہ ہوا اور ایک اخلاقی و معاشرتی تحریک ایک وحانی و ذہنی انقلاب بھاری بھرم اصطلاحات کے بوجھ تلے دب گیا، اور بعض بزرگوں کی باریک بینیوں و نکتہ آفرینیوں کی بھینٹ چڑھ گیا، اس ماحول سے نکلنے والے اور تیار ہو کر آنے والے اچھے متکلم تو بن گئے مگر انسانیت کو متکلم کے بجائے معلم کی ضرورت تھی، بہترین مقرر و مناظر ہو گئے مگر مز کی نہ بن سکے، اخلاق دانی تو آگئی، اخلاق داری نہ رہی، کتاب خوان کثرت سے وجود میں آگئے مگر "صاحب کتاب" لوگوں کا نمٹا پڑ گیا سوز و مارغ تو پیدا ہو گیا مگر سوز جلر پیدا نہ ہوا، دل و دماغ نے جب راہیں جدا کر لیں تو زندگی میں دورِ خاپن پیدا ہونا لازمی امر تھا، فکر و نظر ہم آہنگ نہ رہے تو زندگی میں تضادات کا ابھرنے فطری تقاضہ تھا، سو ایسا ہو کر رہا، اے کاش ایسا نہ ہوتا۔

اب ہم ان اہمات کتب کی تفصیل پیش کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان صحیح فیصلے پر آسانی پہنچ سکتا ہے اگر خدا توفیق دے اور محنت و دیانت کی عادت ہو تو یہ کتابیں پڑھیے اور پھر جو بھی رائے قائم کیجئے اس میں وزن ہوگا، لیکن یہ بات دعویٰ سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کتابوں میں سوائے قرآن و سنت کی تعلیمات کے اور کچھ نہ ملے گا، جن کتابوں کے پڑھنے کا مطالعہ کیا جا رہا ہے یہ تصوف پر قدیم اور مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں اور ارباب تصوف کے ہاں ان کا چلن عام اور ان کی حیثیت ایک دستور العمل کی سی ہے، پہلے ہم ان کتابوں کا نام معہ ان کے مصنفین کے درج کریں گے اور بعد میں ان میں سے چند ایک کا ہلکا پھلکا تعارف اور ان کے مضامین کا مختصر جائزہ لیں گے، مصنفین کے سنیں و وفات بھی احتیاط کے ساتھ درج کیے جا رہے ہیں تاکہ کتاب کی اولیت اور قدامت کا بھی پتہ چل سکے اور ان کے مطالعہ میں ترجیحات بھی آسانی قائم کی جاسکیں، نیز ان کے اکثر مصنفین

وہ مشہور و معروف بزرگ ہیں جن سے عوام و خواص سب بخوبی واقف ہیں اور ان کی عقیدت کا دم بھرتے ہیں، یہ کتابیں محض اخلاق و روحانیت کی علمبردار نہیں بلکہ علم کا بھی شاہکار ہیں اور صوفیاء کرام کی علمی استعداد اور فکری صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

سن وفات	مصنف	نام کتاب
۲۴۴ھ	شیخ عارت المہبی	کتاب الرعایہ
۲۸۶ھ	شیخ ابوسعید خراز	کتاب الصدیق
۳۷۸ھ	شیخ ابونصر سراج	کتاب اللہج
۳۸۶ھ	شیخ ابوطالب مکی	قوت القلوب
۴۱۲ھ	شیخ ابوبکر بن ابواسحاق کلاباری	التعرف لذہب اہل التصوف
۴۶۵ھ	شیخ ابوالقاسم القشیری	رسالہ تشریح
۴۷۲ھ	شیخ سید علی البحریری	کشف المحجوب
۴۸۱ھ	شیخ عبدالشہداء الصاری الرومی	صدر میدان
۵۰۵ھ	امام محمد غزالی	احیاء العلوم
"	"	کیمیائے سعادت
"	"	منہاج العابدین
۵۶۲ھ	شیخ عبدالقادر جیلانی	فتوح الغیب
۵۹۳ھ	شیخ ضیاء الدین سہروردی	آداب المریدین
۶۳۲ھ	شیخ شہاب الدین سہروردی	عوارف المعارف

یہ ہیں وہ کتابیں جنہیں تصوف کے حلقوں میں قبولیت عوام و خواص حاصل ہے، انہیں اگر تصوف کی نصابی کتب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، انہیں اگر عرق

ریزی اور توجہ انہماک سے پڑھا جائے تو نہ صرف یہ کہ الزامات کی قلعی کھل جائے گی۔ بلکہ تصوف اپنی صحیح صورت اور اصلی ناک نقشبے کے ساتھ ہمارے سامنے آجائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ تصوف جسے اپنوں اور غیروں نے نامافوس اور اوق اصطلاحات کا طومار بنا دیا ہے وہ کتنا سادہ اور صاف ستھرا ہے، کتنا پرکشش اور جاذب ہے، اب اگلی چند سطور میں ان کتابوں کے چیدہ چیدہ اور مختصر عنوانات کے لیے وقف کی ہیں تاکہ ان کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے قبل ان سے ملکی سی روشناسی ہو جائے اور ایک قسم کی ذہنی مناسبت پیدا ہو جائے،

## کتاب الرعایہ

تحقیق کی رو سے دستیاب ہونے والی سب سے قدیم ترین کتاب ہے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقریباً تمام مشاہیر صوفیاء نے اپنی تصانیف میں اسکا ذکر خوبصورت پیرائے میں کیا ہے، ان بزرگوں میں شیخ ابوالنضر سراج، شیخ ابوطالب مکی، شیخ ابوبکر کلاباذمی، امام قشیری، داماد بھویری اور دیگر قد آور اور ممتاز افراد شامل ہیں، امام غزالی کی کتاب "احیاء العلوم" میں تو اس کی حیثیت مرجع، ماخذ اور سنگ بنیاد کی سی ہے، صوفیاء کے علاوہ مورخین اور اور متکلمین خطیب بغدادی (م: ۵۴۲۹) نے تاریخ بغداد، شہرستانی (م: ۵۲۸) نے الملل والنحل، ابن خلکان (م: ۵۶۸۱) نے دنیات الاعیان اور الیافعی (م: ۶۸۸) نے مرآة الجنان میں بھی اس کتاب کا ذکر خاص اہمیت سے کیا ہے۔

اس کتاب کے ابواب و عنوانات کچھ اس طرح ہیں، پہلے پانچ ابواب الرعیات لمعوق اللہ کے لیے وقف ہیں۔ چھٹا باب "توابعین" کے طبقات و اقسام اور توبہ کے طریقوں پر مشتمل ہے، باب ہفتم میں "استعداد للموت" کا بیان ہے یعنی یہ یقین



کہ اس دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کے لیے زاہد راہ ہر وقت تیار رہنا چاہیے اور  
 'بزن' سنتی ہلا تامل چل پڑنا چاہیے، پھر اگلی منزل (قبر) میں جو وحشت، تنہائی،  
 تاریکی، اور کیڑے مکوڑوں کا گھر ہے، پڑاؤ کرنے کے لیے اپنی سہولت کی خاطر  
 جملہ اسباب مہیا کر لینا چاہیے، اگلے چھ ابواب ریا، اور اس کی مختلف صورتوں  
 کے لیے مخصوص ہیں، چودھویں باب میں اخلاص کی اہمیت اور ضرورت کو بڑی  
 عمدگی اور خوبصورتی سے واضح کیا گیا ہے اور باقی جملہ ابواب ان مضامین و  
 موضوعات پر مشتمل ہیں، حسد کی برائی، کبر کی مذمت، عجب کی ہلاکت خیزی، شیطان  
 سے خدرو اجتناب کے طریقے، نیت کی تشریح، تواضع کی فضیلت اور آخر میں  
 اس راہ کے راہی کے لیے ایک مبسوط اور مرتب نظام الاوقات ہے، جس کی پابندی  
 سے وہ اصلاح نفس، ضبط نفس اور تزکیہ نفس کر سکتا ہے اور اپنے حقیقی  
 مقصد زندگی کو پاسکتا ہے۔

## کتاب الصدق

یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ شیخ فرید الدین عطار (م: ۶۲۰ھ) نے اس  
 کتاب کے مصنف کو "سان الصدق" لکھا ہے، ضخامت کے اعتبار سے کم مگر  
 معانی و معارف کے لحاظ سے یہ اہم کتاب صدیوں سے صوفیاء کے ہاں ایک مفید  
 صحیفہ سمجھی جاتی ہے اس کتاب میں جس سادگی سے تعلیمات شرعیہ کو بیان کیا گیا ہے  
 یہ اسی کا حصہ ہے۔ کتاب کا رنگ سوال و جواب کا سا ہے، ابتداء میں اخروی نجات  
 کے لیے تین اصولوں کی پیروی کو ضمانت قرار دیا ہے، پہلا اصول اخلاص، دوسرا  
 صدق اور تیسرا صبر ہے، اور ان تینوں کو ایک اکائی قرار دیا ہے اور ایک دوسرے  
 کے لیے جزو لاینفک بتایا ہے، بلکہ یہ تینوں باہم المال و تکمیل کا ذریعہ ہیں اس کے



بعد پھر صدق کی تفصیلات پیش کرنے کے لیے متعدد فصلیں قائم کی ہیں، اخلاص میں صدق، صبر میں صدق، معرفت نفس میں صدق، ورع میں صدق، زہد میں صدق، توکل میں صدق، خوف و خشیت میں صدق، حیا میں صدق اور محبت و معرفت میں صدق، جب ان فصلوں کی تشریح کرتے ہیں تو بالالتزام اس ترتیب کا خیال رکھتے ہیں، اولاً آیت یا آیات قرآنی، ثانیاً احادیث نبوی، ثالثاً آثار و اقوال صحابہ کرام بالخصوص سیدنا صدیق اکبرؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کی سیرتوں سے استدلال و استشاد، اس بقامت کمتر مگر بقیمت بہتر کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد شکی سے شک کی ذہن کیو ہو جاتا ہے کہ فی الواقع تصوف حکم قرآن، فرمان رسولؐ اور اسوہ اصحابؓ کے علاوہ کچھ نہیں، طوالت کا خطرہ ہے ورنہ اس کتاب کے چند روح پرور اور یعتین افروز اقتباسات پیش کیے جاتے :-

## کتاب اللع

اس کتاب کا تعارف خود مصنف کے الفاظ میں یوں ہے :-  
 "میرا مقصد یہ ہے کہ تصوف کے صحیح اصول و قواعد کی وضاحت کر دوں اور یہ ثابت کر دوں کہ یہ اصول کتاب و سنت سے مطابقت تامہ رکھتے ہیں اور اتباع رسولؐ و صحابہ ان کی غایت ہے۔"  
 یہ کتاب بھی مابقی دو کتابوں کی طرح تصوف کے حقیقی خدو حال واضح کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے، مصنف نے اس کتاب کے ایک باب میں قرآن و سنت کو تصوف کا اصلی ماخذ قرار دیا ہے اور صوفیاء کے طریق استنباط کی وضاحت کی ہے، اس کتاب کی خصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ مصنف نے دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے تصوف کے بارے میں دماغوں میں ابھرنے والے اعتراضات

کا بھر پور جائزہ لے کر غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے، اس کتاب کے ضمن میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض مقالات پر اگرچہ مصنف نے بعض صوفیاء کی تسلیات کی تاویل کر کے انہیں صحیح رُخ دینے کی کوشش کی ہے، مگر اصولی طور پر آپ نے مسلک تصوف کو مقید بالکتاب والسنۃ قرار دیا اور تسلیم کیا ہے، اس کتاب میں ان تمام غلط عقیدوں، گمراہ کن نظریوں اور ذہنی اختراحوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے، جنہوں نے تصوف کو ایک سنجیدہ علمی، فکری، معاشرتی، اخلاقی اور روحانی تحریک کے مقام و منصب سے ہٹا کر باریجہ اطفال بنا دیا تھا مثلاً اتحاد و حلول کا باطل نظریہ نیز انہوں نے قرامطہ، باطنیہ اور اس کے دیگر فرق باطلہ کے تمام لغو عقیدوں کی تردید و تہلیل کی ہے، اس کتاب میں تصوف کا وہی مفہوم پیش کیا گیا ہے جو پیشرو بزرگوں نے پیش کیا اور جو اس کا حقیقی مفہوم ہے، یعنی اتباع شریعت، ہم طوالت کے خوف سے بچنے کے لیے اس کے ابواب کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، ان سب کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔

## التعرف لہذہب اہل التصوف

لولا التعرف لماعرف التصوف (اگر کتاب "التعرف" نہ ہوتی تو ہم تصوف سے آگاہ نہ ہوتے، یہ قول شیخ شہاب الدین سہروردی کا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے تعارف کے لیے ایک فقرہ کافی ہے، اس کتاب کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جن کی شہرت چارواٹنگ عالم میں ہے، جس میں اس کے ایجاز و اختصار مگر معانی و معارف سے لبریز ہونے کا خاصہ دخل ہے، یہ کتاب ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے لکھی گئی، جو منصور علاج کے تختہ دار پر لٹکنے کے بعد تصوف کے بارے میں عوام

خواص کے ذہنوں میں پیدا ہو گئی تھیں، حق یہ ہے کہ مصنفؒ کے تصوف کے بارے میں سچے احساس، قلبی اخلاص اور کتاب کی متانت و بخیدگی نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے اور تصوف کے گرد آلود شیشہ کو یوں معفی کر دیا ہے کہ اس میں قرآن و سنت کے نقوش بڑے واضح اور روشن انداز میں دیکھے جاسکتے ہیں کتاب میں مصنفؒ نے زیادہ تر اسلاف صالحین کے اقوال نقل کیے ہیں اگر کہیں تشریح کی ضرورت پڑی ہے تو نہایت ہی مختصر مگر دلنشین انداز میں چند الفاظ لکھ دیے ہیں، اس کتاب کے اول میں صوفیوں کے عقائد و احوال کا ذکر کیا ہے، اور معرفت الہی، ایمان، حقائق ایمان، شرعی مذاہب، تقدیر و خلق افعال، روح، شفاعت اور قرآن کے بارے میں تشریحات قلمبند کی ہیں لیکن اس کتاب کا اصل مقصود اور اس کا عطر و حصہ ہے جہاں تصوف کی تعلیمات پر مشتمل عنوانات باندھے گئے ہیں، تصوف کے متعلق بزرگوں کے اقوال جمع کرنے کے بعد اس کی تعلیمات کی تفصیل دی ہے۔ ان میں کچھ عنوانات یہ ہیں،

توبہ کے بارے میں صوفیاء کے اقوال، زہد کے بارے میں اقوال، صبر کے متعلق اقوال، فقر کے بارے میں اقوال، تواضع کے بارے میں اقوال، خوف کے بارے میں اقوال، تقویٰ کے بارے میں اقوال، اخلاص کے بارے میں اقوال، شکر کے بارے میں اقوال، توکل کے بارے میں اقوال، رضا کے بارے میں اقوال اور یقین کے بارے میں اقوال، مندرجہ بالا عنوانات کسی بھی لحاظ سے شریعت سے نہیں ٹکراتے بلکہ یہی اعمال و احوال شریعت کی روح اور غرض و غایت ہیں، تصوف کو سمجھنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی کتاب جامع اور مفید نہیں اگرچہ رسالہ تشریح اور کیمیائے سعادت بھی بہت کارآمد کتابیں ہیں مگر اس کتاب کے اختصار نے اسے چارچاند لگا دیے ہیں اور اسے بجا طور پر تصوف کا "انسائیکلو پیڈیا" کہا جاسکتا ہے، اس

کتاب کے آخر میں اگرچہ خاص قسم کی صوفیانہ اصطلاحات و کیفیات کا ذکر آگیا پھر بھی ان اصطلاحات کو اس دور کے تناظر میں دیکھنے اور اس کتاب کے بیان کی سادگی و صفائی کو پیش نظر رکھنے کے باعث طبیعت بوجھ اور وحشت محسوس نہیں کرتی، بلکہ ہلکے پھلکے انداز کی وجہ سے طبیعت ایک خاص قسم کا سرور اور ذوق محسوس کرتی ہے ان اصطلاحات میں غیبت و شہود، تجلی و استتار، فنا و بقا، سکرو محو، اور تجرید و تفرید وغیرہم شامل ہیں لیکن ان کے بارے میں جس انداز میں اظہار خیال کیا گیا اور جو اقوال پیش کیے گئے ہیں وہ اس قدر سچیدہ یا مشکل نہیں جس کے سمجھنے کے لیے سقراطی ذہن اور افلاطونی دماغ درکار ہو، ذرا سی توجہ سے ان کا مفہوم دماغ میں اتارا جاسکتا ہے، بہر کیفیت یہ کتاب جس طرح اپنے اوائل دور میں اہم تھی اب بھی اس کی اہمیت برقرار ہے بلکہ دوچند ہو گئی ہے۔

## رسالہ قشیریہ

یوں تو اس کتاب سے پیشتر تصوف پر خاصا کام ہو چکا تھا مگر ابھی تک حسن ترتیب اور حسن تنوع کی حامل ایک کتاب کی ضرورت تھی، امام ابو قاسم قشیریؒ نے یہ کتاب لکھ اس ضرورت کو پورا کر دیا، اور جس بالغ نظری سے آپ نے یہ کام کیا آپ ہی کا حصہ ہے، امام نہ صرف ایک معروف صوفی ہیں بلکہ آپ کا شمار حفاظ حدیث میں بھی ہوتا ہے، اس لیے کتاب میں قرآنی آیات کے بعد جب احادیث کا حوالہ آتا ہے تو حوالے کی اہمیت اور دلچسپی اس وقت بڑھ جاتی ہے، جب احادیث اپنی سند سے پیش کرتے ہیں، اس کتاب کی اہمیت و وقعت کتنی ہے اس کا اندازہ تصوف و صوفیاء کے مخالفین کے سرخیل امام ابن تیمیہؒ کے اس قول سے ہو جاتا ہے۔

”اگر تصوف کا مطالعہ کرنا ہو تو رسالہ قشیریہ کا مطالعہ کیا جائے۔“

فارسی زبان میں سب سے اولین اور مستند تالیف شیخ علی ہجویری رحمہ اللہ کی ”کشف المحجوب“ ہے زبان بیان کے اعتبار سے سادہ اور واضح ہے، اس میں رسالہ قشیریہ کا تمسح کیا گیا ہے یہ بھی رسالہ کی اہمیت کو واضح کرتے کے لیے ایک دلیل ہے یہ کتاب کیوں کہ منصفہ تالیف پر آئی؟ اس کی وجہ خود مصنف بیان فرماتے ہیں۔

”طریقت میں خلا پیدا ہو گیا ہے، نہیں بلکہ درحقیقت طریقت مرط چلی

ہے، جن شیوخ سے لوگ ہدایت پاتے تھے گد چلے ہیں اور اب وہ

نوجوان بھی کم پائے جاتے ہیں جو ان شیوخ کے اخلاق و سیرت

کی پیروی کرتے تھے، پرہیزگاری جاتی رہی اور اس کی بساط لپیٹ لی

گئی اور لالچ بڑھ گیا اور اس کی پٹانیں مضبوط ہو گئیں لوگوں کے دلوں

سے شریعت کا احترام اٹھ گیا، حلال و حرام میں تمیز کرنا چھوڑ دیا، لوگ

عبادات کے ادا کرنے کو حقارت سے دیکھتے ہیں، صوم و صلوٰہ کی اہانت

کرتے ہیں، غفلت کے میدان میں گھوڑے دوڑاتے ہیں اور اپنی خواہشات

کی تابعداری میں لگے ہوئے ہیں..... یہ لوگ اس قسم کی

بد اعمالیوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھا کر حقائق

اور احوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں..... وہ اس بات

کے مدعی ہیں کہ وہ حق پر قائم ہیں اور حق کے احکام جو ان پر جاری

ہوتے ہیں وہ تو محو ہو چکے ہیں چاہیں وہ کریں یا نہ کریں اللہ انہیں

عتاب و ملامت نہیں کرتا..... جب میں نے یہ دیکھا کہ

آج کل اللہ کی طرف سے ہماری آزمائش طول پکڑ چکی ہے.....

مجھے اس بات پر غیبت آئی کہ اہل طریقت کو برائی سے یاد کیا جاتا ہے

اور مخالفین ان پر نکتہ چینی کیے جانے سے لطف اٹھاتے ہیں.....  
 .... میں امید کرتا تھا کہ اس خلائق کے اسباب معدوم ہو جائیں گے  
 ..... لیکن مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کر  
 بیٹھیں کہ طریقت کے قواعد کی بنیاد ہی انہی امور پر ہے اور ان کے  
 اسلاف بھی اس قسم کی روش اختیار کرتے رہے، لہذا یہ رسالہ لکھ  
 کریں نے آپ لوگوں کو بھیجا۔

مصنف کی زبانی تصنیف کی غرض دعایت ہی بتا رہی ہے کہ رسالہ کن  
 موضوعات و مضامین پر مشتمل ہوگا، جو شخص شرعی حدود کی پامالی، اخلاقی گراؤ،  
 تقویٰ کے عدم لحاظ، حلال و حرام کی تمیز کے فقدان، بد اعمالیوں پر اصرار اور خواہشوں  
 کی پیروی پر کڑھن اور دکھ محسوس کر رہا ہے وہ خود کس طرح ایسے مسلک کی ترویج و  
 اشاعت ایک مستقل رسالہ کے ذریعے سے کر سکتا ہے، جس مسلک کا شریعت  
 سے کوئی تعلق نہ ہو، قشری کے ہاں وہی تصوف رائج اور راجح ہے، جس کے نہ  
 صرف ڈانڈے شریعت سے ملتے ہیں، بلکہ شریعت ہی کے سوتے سے اس کے  
 فوارے پھوٹتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، یہ رسالہ متنوع اور وسیع الاطراف ہے، اس میں  
 جہاں تعلیمات تصوف کا بیان ہے وہاں مشائخ کبار کی سوانح بھی ہیں ایک طرف  
 اگر کرامت پر بحث کی گئی ہے تو دوسری جانب مرید کے لیے وصایا بھی مرتب  
 کیے گئے ہیں، ہم چونکہ موضوع کو طول دینا پسند نہیں کرتے اس لیے رسالہ میں مندرجہ  
 مضامین کا بالاستیعاب احاطہ نہیں کرتے بلکہ صرف ان ابواب کا ذکر  
 کیے دیتے ہیں جو رسالے کا اصل لب لباب ہیں یعنی اخلاق و اعمال، جنہیں دیکھنے  
 کے بعد ایک بار پھر یقین ہو جائے گا کہ تصوف واقعہ شریعت کے تنے سے

نکلی ہوئی ایک شاخ ہے، شیخؒ کے صوفیانہ اصطلاحات پر بھی لکھا ہے ان اصطلاحات میں وقت، مقام، حال، قبض، بسط، ہیبت، انس، تواجد، وجود، وجد، جمع، فرق، فنا، بقا، غیبت، حضور، صحو، سکر، محو، اثبات اور تلویح، تمکین وغیرہ شامل ہیں، لیکن انہیں پیچیدہ بنانے کے بجائے شیخؒ نے بڑی سادگی اور عمدگی سے ان کی تشریح کر دی ہے، ان ابجاث کو پڑھنے سے ایک شخص اپنی معلومات میں اضافہ محسوس کرتا ہے، اخلاق و اعمال کے سلسلہ میں ابواب کی تفصیل درج ذیل ہے :-

توبہ - تقویٰ - ورع - زہد - خوف - رجاہ - خشوع و تواضع - حسد - قناعت - توکل - شکر - صبر - اخلاص - صدق - فتوت - خلق اور فقر وغیرہم۔

رسالہ کے تعارف کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ فی الحقیقت، تصوف، قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔

## صد میدان

یہ کتاب اس جلیل القدر شیخؒ کی تصنیف ہے، جو بیک وقت محدث اور متصوف تھا، عربی ادب میں درک اور شعفت کا یہ عالم تھا کہ ایک آیت کی تفسیر و تشریح کے وقت عربی کے چار چار سواشعار کے زبانی حوالے دیا کرتے تھے، بارہ ہزار حدیثیں اسناد صحیحہ کے ساتھ یاد تھیں، آپ صرف محدث، لویب اور متصوف ہی نہ تھے بلکہ اس قافلہٴ سخت جان کے ایک فرد فرید تھے، جو ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لیے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ یہی کچھ آپ کے ساتھ ہوا، الزامات کی بوچھاڑ، مخالفین، طعن و تشنیع اور وہ سب کچھ جو راستے میں



رکاوٹ بن سکتا مگر آپ نے پامروئی کے ساتھ یہ سنگلاخ وادی عبور کر ڈالی اور یوں ایک داستان رقم کر دی، قرآن و سنت کی ترویج و اشاعت آپ کی زندگی کا مقصد تھا، قلمی و ذہنی تبلیغ کا سلسلہ بھی عرصہ دراز تک جاری رکھا، زیر تبصرہ کتاب آپ کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے، آپ کے ایک مرید نے اسے مرتب کیا جس سے تصوف کی بند پائیہ اور بنیادی کتابوں میں ایک حسین اضافہ ہوا، اس کتاب میں "وصول الی اللہ" کے ان مقامات کا ذکر ہے جن سے گزر کر طالبِ صادق اپنے مطلوبِ حقیقی کو پالیتا ہے، ہر مقام کی مناسب تشریح سے پہلے اکثر و بیشتر قرآنی آیات سے استناد کیا گیا ہے اور پھر ہر ایک کے ضمن میں تین تین نکات بیان کیے گئے ہیں، ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

## صبر

ساتواں میدان صبر ہے، قصد کے میدان سے صبر کا میدان نکلتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وان تصبروا خیر لکم (۲۵: ۴)

(اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا)

صبر کے تین ارکان ہیں :-

۱۔ مصیبت پر صبر کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اصبروا"

۲۔ مصیبت پر صبر کرنا جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وصبروا"

۳۔ طاعت پر صبر کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ورابطوا"

تکلیف پر صبر محبت کے باعث کیا جاتا ہے اور اس سے تین چیزیں برآمد ہوتی ہیں :-

۱۱۱

اسی انداز میں دوسرے سومیدانوں کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں، توبہ، انابت، مروت، فتوت، صبر، محاسبہ، زہد، تقویٰ، یقین، بصیرت، توکل، رضا، اخلاص، بتسل، اخلاص، عزم، استقامت، تفکر، تدکر، فقر، تواضع، خوف، خشوع، رجا، احسان، صدق، صفا، حیا، ایثار، تفرغ، توجید، علم، حکمت، وغیرہم۔

یہ کتاب مصنف کی شرف نگاہی اور نکتہ رسی کا عمدہ شاہکار اور طالبین دین کے لیے ایک روحانی اور اخلاقی سوغات ہے۔

## منہاج العابدین

امام غزالی کے دوسرے دور کی تصنیفات میں سے احیاء العلوم، کیمیائے سعادت اور منہاج العابدین ہمارے پیش نظر ہیں، دل تو یہ چاہتا ہے کہ ان تینوں عظیم ضخیم اور نہایت ہی گراں قدر کتابوں کا جائزہ لیا جائے، لیکن طوالت کا خوف دامنگیر ہے اس لیے ممکن نہیں، البتہ طبیعت میں یہ کشمکش برپا ہے کہ جائزہ اور تعارف کے لیے کس کتاب کا انتخاب کیا جائے جبکہ ہر کتاب اپنی جگہ پر درجے بہا اور گوہر نایاب ہے، "احیاء العلوم" پر نظر پڑتی ہے تو اس کی عظمتوں کا کنارہ نظر نہیں آتا، یہ وہ عظیم المرتبت اور ضخیم کتاب ہے جو بعض محققین کے نزدیک اس دور کی تصنیف ہے، جب امام پر جذب و شوق کی کیفیت طاری تھی۔ اس کتاب کو شیخ علی نے پچیس مرتبہ حرفاً حرفاً پڑھا اور ہر مرتبہ خاتمے پر ایک عام دعوت کا اہتمام کیا۔

"شیخ محی الدین اکبر احیاء العلوم کا مطالعہ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔" کیمیائے سعادت "سلسلے آتی توبہ دامن کھینچ لیتی ہے، آخر وہ کتاب کتنی بلند پایہ

ہوگی جسے خود مصنف کی میاں سعادت قرار دے رہا ہے، اس کتاب میں کوئی ایسا رکن باقی نہیں رہا جو اصلاح اخلاق و معاشرت کے لیے ضروری ہو، مگر اس میں درج نہ کیا گیا ہو، بنا بریں یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ اس کا بھرپور جائزہ لیا اور تعارف حاصل کیا جائے، مگر یہاں وہی خوف طوالت ہے جو قلم کی عنان کھینچ لیتا ہے۔ یہی تیسری کتاب "منہاج العابدین الیٰ جنت رب العالمین" تو یہ وہ کتاب ہے جس کے بارہ میں مصنف خود رقمطراز ہیں :-

"اس (اللہ تعالیٰ) نے اپنے فضل و کرم سے عبادت کے عجیب و غریب اسرار و رموز پر مطلع فرمایا اور مجھے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا الہام فرمایا، ایسی ترتیب میں کسی اور کتاب کی تصنیف میں قائم نہیں کر سکا۔ یہ وہ تصنیف ہے جس کی میں خود تعریف کرتا ہوں۔"

امام غزالیؒ کی یہ آخری تصنیف ہے، جسے بجا طور پر امامؒ کے افکار کا آئینہ کہا جاسکتا ہے، امام نے اس کتاب میں سات گھاٹیوں کا ذکر فرمایا ہے، جنہیں عبور کر کے انسان خدا کی جنت میں داخل اور قرب خداوندی سے سرفراز ہو سکتا ہے ان گھاٹیوں کی ترتیب اس طرح ہے۔ پہلی گھاٹی علم، دوسری توبہ، تیسری عواقب و موانع، چوتھی عوارض، پانچویں بواعث، یعنی عبادت پر ابھارنے والی چیزیں، چھٹی قواعد یعنی عبادت میں خرابیاں پیدا کرنے والی اور ساتویں حمد و شکر، پھر ان کی تشریح میں اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ پہلے قرآنی آیات سے استناد کیا گیا، پھر احادیث نبویہ نقل کی گئیں، پھر اس کے بعد ضروری توضیح و تشریح کر دی گئی، یہ کتاب اس قدر مرتب، مربوط، مسلسل اور پرکشش ہے کہ رقم الحروف کے تجربے و مشاہدے کے مطابق پوری کتاب پڑھے بغیر کروٹ بدلنے کو جی نہیں چاہتا، کیونکہ جب یہ کتاب لکھی گئی تو اس وقت مصنف محمد بن محمد نہیں بلکہ

امام غزالیؒ تھا، جامعہ نظامیہ کا قال اتولی مدرس نہیں بلکہ اخلاقیات کا معلم تھا مکتب کا خشک فاضل نہیں بلکہ بیاباں نوردی کر کے فاروقی و سلماقی روح اپنے اندر پیدا کر چکا تھا، اس کا علم "سقیۃ" میں نہ تھا بلکہ اب سینے میں آچکا تھا، منہاج العابدین کا مصنف کتاب لکھتے وقت "از دل خیزد بر دل ریزد" والی کیفیت کے مقام پر تھا، تو پھر کیوں نہ کتاب میں تاثیر کشش اور عمل پر ابھارنے والی کیفیت پیدا ہوتی، کتاب کے ایک مقام پر داعیانہ اور مصلحانہ رنگ ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں،

"کیونکہ دونوں قسم کے ظاہری و باطنی احکام کے متعلق ایک ہی رب نے ایک ہی کتاب میں حکم دیا ہے، مگر تم باطنی اور اوصاف سے مطلقاً بے خبر ہو چکے ہو اور ایسے لوگوں کے لیے فتوے لکھتے ہیں مصروف، جو جنہوں نے دنیا ہی کو کعبہ مقصود ٹھہرایا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے نیکی کو برائی کا اور برائی کو نیکی کا درجہ دے دیا ہے انہوں نے تم ایسے لوگوں کے لیے فتویٰ نویسی میں مشغول ہو کر پاکیزہ علوم سے بے پروا ہو گئے ہو، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں نور، حکمت اور ہدایت وغیرہ کے الفاظ سے تیسر فرمایا ہے.... اے بھلائی کے دعویدارو! تمہیں اس کا خوف نہیں کہ بڑے بڑے فرانس کو پس پشت ڈال رہے ہو اور نقل نماز روزہ میں مشغول ہو، فرانس سے تارک ہو کر نوافل ادا کرنے والو! ان نوافل کی کوئی وقت نہیں۔"

قارئین جان گئے ہوں گے کہ امام غزالیؒ کس قسم کے تصوف کے علمبردار ہیں، تصوف کو مسک سکر کہا جاتا ہے ذرا انصاف کا دامن تھا میسے اور دیانت کو آواز دے کیسے کیا یہ "مسک سکر" ہے یا "مذہب صحر" ہے، واجبات شرعیہ کی

ادائیگی اور فرائض کی سرانجامی کے لیے یہ تڑپ، یہ بیقراری، یہ سوز اور یہ درد "سکر"  
کی غمازی کر رہا ہے یا صحران کی!

## فتوح الغیب

یہ کتاب اس نامور اور مشہور زمانہ بزرگ کی تصنیف ہے جسے غوثِ اعظم  
محمی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے نام نامی اسم گرامی سے یاد کیا جاتا ہے، یہ وہ عظیم  
المرتبہ شخصیت ہے جسے عوام و خواص دونوں طبقوں میں لازوال شہرت و عزت  
حاصل ہے، آپ کی خدماتِ جلیلہ کا جائزہ لیا جائے تو آپ پر محی الدینؒ کا لقب صحیح  
معنوں میں صادق آیا ہے، آپ نے واقعہٴ اسلام کی غوطے کھاتی کشتی کو ساحل پر پہنچا  
دیا، اس مرد مولانا نے جھونپڑی میں بیٹھ کر اس انداز میں دلوں پر حکمرانی کی کہ رطبے بڑے  
بادشاہوں نے تخت و سہاہ کے باوجود بھی اس طرح فرمانروائی نہ کی ہوگی، اس  
بیک درجہ سے اسلام کو اتنا فائدہ پہنچا جس کا مقابلہ ہزاروں لاکھوں انسانی نفوس  
نہیں کر سکتے، آپ نے تزکیہٴ باطن، تصفیہٴ قلب، اصلاحِ اخلاق و اعمال، ترویج  
شریعت، اشاعتِ اسلام اور استیلائے حق کا اس قدر بھاری کام سرانجام  
دیا کہ ایک زمانہ انگشت بندھاں ہے، آپ کی یوں تو متعدد تصنیفات و تالیفات  
ہیں اور ہر تصنیف و تالیف اپنی جگہ قابلِ قدر اور اہم ہے مگر ان میں "فتوح الغیب"  
جیسی مختصر مگر جامع کتاب کو ایک خاص منزلت اور اہمیت حاصل ہے، شیخ عبدالقادر  
جیلانیؒ اقتباسیہ میں لکھتے ہیں۔

یہ چند کلمات ہیں جو "فتوح الغیب" سے مجھ پر ظاہر ہوئے، دل میں  
اتر گئے اور بھر گئے۔ پھر راستی حال نے ان کو باہر لاکر ظاہر کیا اور اللہ کی  
رحمت و مہربانی سے ان کلمات کو مریدوں اور راہِ حق کے طالبوں کی

رہنمائی کے لیے قالبِ گفتارِ صحیح میں ظاہر کرنے پر میری مدد فرمائی۔  
یہ کتاب اٹھتر مقالات پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ حکمت و موعظت کا خزینہ  
بے بہا ہے، جس کی سادگی اور دل میں کھب جانے والے انداز میں شیخؒ نے بات  
کی ہے یہ سلیقہ شائد ہی کسی کو آتا ہو، یہ کتاب جہاں ایک ظرف و غنط و نصیحت  
سے لبریز اور معنوی محاسن سے بھرپور ہے وہاں اس کے الفاظ کا درو بست، صحیح  
انتخاب اور بر عمل استعمال اس کتاب کو ایک ادبی شہ پارہ بنا دیتا ہے، مقالے  
کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، یہ ساتواں مقالہ ہے، عنوان ”اذہاب غم القلب“ یعنی  
دل کی پریشانی کیوں کر دور ہو، فرماتے ہیں:-

ہر چیز اللہ کو سونپ دے اور اپنے دل کے دروازہ پر اللہ کا دربان  
بن جا، وہ دل میں آنے کا جسے حکم دے اُسے آنے دے اور جسے منع  
کرے اسے روک دے پس ہوائے نفس کو دل سے نکل جانے کے  
بعد پھر دل میں نہ آنے دے۔

اس کتاب کے مقالات کے مضامین یہ ہیں:-

مقالہ ۱ بہتر کاموں کی نصیحت، مقالہ ۱۳ احکام خداوندی مان لینے  
کا بیان، مقالہ نمبر ۱۵ خوف ورجاء، مقالہ ۱۶ توکل اور اس کے مقالات،  
مقالہ ۱۸ نزول بلا پر شکایت نہ کرنے کی تاکید، مقالہ ۲۴ باب الہی کو مضبوط  
پکڑنے کی تاکید، مقالہ ۲۶ خیر و شر دو میوے ہیں، مقالہ ۳۳ خدا کے لیے بعض  
اور محبت کرنا، مقالہ ۵۳ خوشنودی الہی طلب کرنے کی تاکید، مقالہ ۵۴ عمل پر  
مغرور نہ ہونے کی تاکید، مقالہ ۵۵ آٹھ خصلتوں پر تصوف کی بناء ہے۔

یہ تھا فتوح الغیب کا اجمالی تعارف، اب قارئین خود فیصلہ فرمائیں کہ شیخ  
عارف مجاہدؒ ہوں یا ابوسعید خرازؒ، امام قشیریؒ ہوں یا داتا گنج بخشؒ، امام غزالیؒ

ہوں یا شیخ عبدالقادر جیلانی ان سب کا تصوف کیا تھا؟

## کشف المحجوب

عربی میں تصوف کی قدیم ترین کتاب جس طرح کتاب الرعاۃ ہے اسی طرح فارسی میں تصوف کی قدیم ترین کتاب کشف المحجوب ہے، اور تصوف پر رصغیر پاک و ہند میں لکھی جانے والی پہلی کتاب یہی ہے، اس کتاب کے مصنف سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش ہیں، داتا ہجویری کو مسلمانان پاک و ہند میں جو عظمت و شہرت حاصل ہے ایسی مثالیں تاریخ میں خال خال ملتی ہیں، جیسا کہ رسالہ قشیریہ کے تعارف میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت داتا ہجویریؒ نے اپنی تالیف و تصنیف کے لیے اپنے قریب معاصر امام ابوالقاسم قشیریؒ کے رسالے کو نمونہ قرار دے کر اس کا تتبع کیا مگر کشف المحجوب کی انفرادیت اپنی جگہ قائم اور مسلم رہی اور وہ یوں کہ امام قشیریؒ نے اپنی کتاب میں زیادہ تر متقدمین کے حوالوں پر اکتفا کیا ہے اور ان کے اقوال و حوال کو کافی سمجھا ہے مگر خود ہجویریؒ نے اپنی تالیف میں مجتہدانہ اور متفقانہ طرز اختیار کیا ہے، اس میں آپ نے ذاتی مشاہدات و روایات کا ذکر کر کے کتاب کی ثقاہت اور دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے، ایک سائل نے تصوف کی ماہیت سمجھنے کی غرض سے کچھ سوالات کیے آپ نے جواب کے طور پر یہ متفقانہ اور لاجواب کتاب قلمبند فرمادی،

اس کتاب کے مندرجات اور عنوانات اس کا بہترین تعارف ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آئمہ صوفیاء کن رجحانات کے حامل تھے، عنوانات کی ایک جھلک بولب کی حسن ترتیب اور مضامین کا تنوع ملاحظہ ہو۔

پہلا باب، ماہیت علم، علم کے اقسام، معرفت و شریعت، سونسطائیہ،

اہل تصوف کے اقوال۔

دوسرا باب: اثبات فقر، درویش کی بزرگی، فقر و غنا سے متعلق اہل تصوف کے اقوال -

تیسرا باب: تصوف، لفظ صوفی سے کیا مراد ہے؛ معنا

ساتواں باب: صحابہ کرام، مناقب و فضائل -

آٹھواں باب: اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین -

نواں باب: اہل صفہ، حالات و مناقب

چودھویں باب سے کشف کا سلسلہ چلتا ہے، ان میں اسلامی تعلیمات کا

عطر اور خلاصہ آگیا ہے۔ مثلاً

کشف حجاب اول: معرفت حق، عقل و معرفت، حقیقت معرفت، رموز معرفت۔

کشف حجاب دوم: توحید، توحید کے تین پہلو، توحید کا تصور۔

کشف حجاب سوم: ایمان، ماہیت ایمان، ایمان۔ اصل اور فرع، معرفت اور عبادت،

ایمان اور جبر و قدر۔

کشف حجاب چہارم: طہارت، ظاہری و باطنی طہارت -

پندرہواں باب: توبہ، توبہ سے متعلقہ امور، گناہ کی یاد، توبہ کی تین صورتیں،

الغرض یہ کتاب تصوف کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں متنوع پھول سجے

ہیں ہر پھول کا رنگ جدا اور خوشبو منفرد، کتاب میں مخدوم سچویری نے ان نام نہاد صوفیاء کا

تعاقب کیا ہے جو اس بباد سے میں تصوف کی بدنامی اور صوفیاء کی رسوائی کا باعث بنتے

ہیں یہ کتاب علم و عمل کا ایسا حسین مرقع ہے جس کی ہر دور میں ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جادہ

حق پر چلنے کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد یہ

دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تصوف کو سمجھنے کے لیے اسی ایک کتاب کا مطالعہ کافی ہے، جس

سے تصوف کے تمام گوشے پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں اور کوئی الجھن باقی نہیں رہتی،



# اشاعت اسلام اور صوفیاء کرام

صوفیاء کرام کے بارے میں گوشہ نشینی اور عزت گزینی کا جو تاثر ہے، منجملہ دیگر تاثرات کے یہ بھی غلط ہے، اگر انصاف کی نظر سے صوفیاء کرام کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے، تو صوفیاء کی زندگی آرام و آسائش، عاقبت اور اطمینان کی نہیں بلکہ جدوجہد اور کشمکش کی زندگی دکھائی دیتی ہے، نامساعد فضا، ناسازگار ماحول، نامالوس آب ہوا اور ناخوشگوار حالات میں دینی و ملی ذمہ داری کی انجام دہی صوفیاء کرام کا کام ہے، کٹھن حالات میں جو سخت کام صوفیاء کرام نے کیا ہے، اس کا تصور بھی انسان کو لرزا دیتا ہے اور صوفیاء کرام کی محنت، سخت کوشی اور اخلاص و ایقان کا قائل بنا دیتا ہے برصغیر پاک و ہند میں اشاعت اسلام کا سہرا صوفیاء کرام کے سر ہے، صوفیاء کی کوششوں کا ذکر کیے بغیر برصغیر کی اشاعت اسلام کی تاریخ تکمیل نہیں ہوتی لیکن جن حالات میں صوفیاء نے اشاعت اسلام کا کام سرانجام دیا اسے وہی شخص جان سکتا ہے جسے ہندوستان کی اخلاقی اور معاشرتی حالت کا کما حقہ علم ہو، خداؤں کی حد سے برامی ہوئی کثرت، جنسی خواہشات کی بھرائی کیفیت، طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات کی لعنت کے دور میں توحید پرستی کا درس، منبسط نفس کی تلقین اور انسانی وحدت و اخوت کا پیغام جس جاں گسل اور صبر آزما محنت کا متقاضی ہے اسے ہر شخص بخوبی جانتا ہے اور صوفیاء نے یہی کچھ کیا ہے، دلوں میں ایک خدا کے لیے جذبہ عبادت اور

محبت، کردار میں پاکیزگی اور عفت اور انسانوں کے مختلف طبقات میں وحدتِ مومنیت پیدا کر کے صوفیاء نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

اس وقت کے ہندوستان کی معاشرتی اور اخلاقی حالت کیا تھی؟ ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔

ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم کچھ اس طرح تھی، برہمن (ہندہپی پیشوا) کھشتری (لڑنے والے) ویش (زراعت و تجارت پیشہ) اور شودر (خادم و غلام)۔

ان کے درجات پیدائش کیا تھے؟

”قادرِ مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لیے اپنے منہ سے، اپنے بازوؤں سے، اپنی رانوں سے اور اپنے پاؤں سے برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔“

ان کے ذمے کیا وظائف تھے؟

”برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے چڑھاوے دینا فرض قرار دیا۔“

”کھشتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے،

چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور خواہشات نفسانی میں نہ پڑے۔“

”ویش کو اس نے حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، چڑھاوے چڑھائے

تجارت، لین دین اور زراعت کرے۔“

”شودر کے لیے قادرِ مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا وہ ان تینوں

کی خدمت کرنا ہے۔“

چھوت چھات کی کیا کیفیت تھی؟

”اگر شود کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اس کو وہ تعلیم دے سکتا ہے۔ تو کوٹنا ہوا تیل اس کو پلایا جائے۔“

کہتے، بلی، مینڈک، کوٹے اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے، ”لہ

اس ماحول میں انسانی مساوات اور وحدت کا پیغام جہاں ایک طرف انقلاب آفریں تھا وہاں جیات بخش بھی تھا، جہاں اپنے اندر بے پناہ مشکلات اور مصائب رکھتا تھا وہاں پس اور دبی ہوئی قوموں کے لیے مشرورہ جانفزا بھی تھا، صوفیاء کرام اپنے مشن میں کس قدر کامیاب ہوئے، اس کا جواب اگلے صفحات میں آ رہا ہے، تاہم دعوتِ اسلام کا مختصر سا جائزہ سرولیم منہٹر کے حوالے سے پروفیسر آر نلڈ کی زبانی سنئے، لکھتے ہیں :-

”بنگال کے ان مفلس لوگوں کے لیے جن میں ماہی گیری، تسکاری، ہندی قزاق اور بیچ ذات کے کاشتکار شامل تھے، اسلام ایک نعمت عظمیٰ تھا، جو ان پر عرش بریں سے اترا، اسلام حکمران قوم کا مذہب تھا اور اس کے پر سوشل مبلغ خدا کی توحید اور انسانی مساوات کا مشرورہ لے کر ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جس کو سب لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے اور جس کا کوئی پرسان حال نہ تھا،“ لگہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع صوفیاء کرام کی تبلیغی مساعی اور خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کے حالات و کوائف کے بارے میں لکھتے ہیں،

یہاں کے لوگ ان مبلغوں سے انتہائی اختلاف رکھتے تھے، ان کی زبان اہل ملک سے انتہائی مختلف، ان کا دین ان سے بالکل مختلف، غیروں کو یہاں والے پیچہ کہتے تھے، ان سے میل جول، شادی بیاہ،

قربت، ہم نشینی، کھانا پینا سب کو ناجائز سمجھتے تھے، مسلمانوں سے رسوم و عادات میں ان کا اختلاف اس حد تک تھا کہ بقول البیرونی "وہ اپنے بچوں کو ان سے، اُن کے لباس سے اور ان کی شکل و صورت سے ڈرایا کرتے تھے"۔

حضرت سید علی البجوری المعروف داماد گنج بخش "کشف المحجوب میں لکھتے ہیں۔ "اس وقت میں دیار ہند کے شہر لاہور میں ناہنوں کے درمیان گرفتار ہوں۔" سیر الاولیاء میں جابجا خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر اور آپ کے مریدوں کے سانپوں سے ڈسے جانے کا بار بار ذکر ملتا ہے جب خواجہ فرید گنج شکر شیخ کے حکم سے اجودھن تشریف لائے اور اسے تبلیغ و وعظ کا مرکز بنایا تو اس وقت اجودھن کی اخلاقی، علمی اور مذہبی حالت کیا تھی؟ حامد بن فضل اللہ جمالی لکھتے ہیں، "وہ ایک خراب مقام تھا، وہاں آرام کیا، اس قصبے میں لوگ زیادہ تر خراب طبع، بد مزاج اور بد اعتقاد تھے"۔

تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے مرکز کی عمارت کیا تھی؟ سہولتیں کیسی تھیں؟ رہائش کا بندوبست کس طرح تھا؟ اور کھانے پینے کے ذرائع کیا تھے؟ ملاحظہ فرمائیے۔ "قصبہ سے باہر کچھ درخت تھے، ان میں سے ایک بڑا درخت دیکھا اس درخت کے نیچے کبیل بچپا دیا اور عبادتِ الہی میں مشغول ہو گئے"۔

خواجہ نظام الدین فرماتے ہیں۔

"حضرت خواجہ فرید نے پیلو پر گزارہ کیا۔"

خواجہ نظام الدین اولیاء نے جب جادہ رشد و ہدایت پر قدم رکھا اور اللہ کا نام لے کر اللہ کا کام شروع کیا تو کئی مشکلات اور دشواریوں سے گزرنا پڑا، آپ بیٹی

کا ایک ورق۔

میرے پاس ایک دانگ بھی نہ ہوتا کہ اس سے میں روٹیاں خرید کر خود کھاؤں اور والدہ، ہمشیرہ اور گھر کے ان لوگوں کو کھلاؤں، جو میری کفالت میں تھے، خرپوزہ کی ارزانی اور فراوانی کے باوجود پوری فصل گزر جاتی اور خرپوزہ چکھنا نصیب نہ ہوتا۔

حالات کی یہ ناسازگاری، مگر اشاعتِ اسلام کی بیقراری، بزرگانِ دین کو چین نہ لینے دیتی، بھوکے پیٹ خشک تالو، پیاسے ہونٹوں، ٹوٹے بوریے اور شکستہ حالت میں کیا کلر نامے سر انجام دیے، تاریخ کو آج تک اس پر ناز ہے، ناسازی حالات کے باوجود ان نیک طینت انسانوں کے منہ سے جو کچھ نکلتا، دل پر پڑتا، الفاظ جتنے سادہ ہوتے تاثیر اتنی زیادہ ہوتی، ان کے قول و عمل کی ہم آہنگی لوگوں کو پیکرِ عمل بنا دیتی برصغیر پاک و ہند کی حدود میں داخل ہونے والے پہلے مبلغِ اسلام اپنی جملہ بے سروسامانی کے ساتھ وہ کام کر گئے جو شاندار سے بھی سر انجام نہ دے سکتے، ان کی نسبت پروفیسر آرڈر قمر انہ میں -

”ابتدائی دور کے بزرگان میں سے ایک بزرگ شیخ اسماعیلؒ ہیں جو بخارا کے ساداتِ عظام میں سے تھے اور دینی و دنیوی علوم میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے مبلغِ اسلام تھے جو ۳۹۵ء میں لاہور شہر میں وارد ہوئے اور وہاں تبلیغِ اسلام میں مصروف ہوئے، ان کی مجلس و عظیم لوگ بکثرت شریک ہوتے تھے اور نو مسلموں کی تعداد ہر روز بڑھتی جاتی تھی، کتھ میں کہ جو شخص ان کے وعظ میں ایک مرتبہ آ جاتا وہ اسلام قبول کیے بغیر نہ جاتا تھا“۔

ہندوستان میں تبلیغِ اسلام کا سب سے زیادہ کام خواجہ معین الدین حسن بھری پٹی نے سر انجام دیا اور آپ اور آپ کے خلفاء کی بے پناہ کوشش سے

ہندوستان کا چہرہ چہ نورِ اسلام سے منور ہو گیا، آپ کے اثرات مسلمانوں میں آج بھی نسلاً بعد نسل موجود اور لوگوں کے دل آپ کی عقیدت سے معمور ہیں، آپ نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لیے خطہ ہند کیوں منتخب فرمایا؟ یہ ایک دلچسپ اور ایمان افروز داستان ہے، اقباسِ ملاحظہ فرمائیے،

”مشورے سے جب خواجہ صاحب مدنیہ منورہ کی زیارت کے لیے گئے تو وہاں آپ کو ہندوستان کے کفار میں تبلیغِ اسلام کا حکم ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور ان سے فرمایا: خدا نے ہندوستان کا ملک تیرے سپرد فرمایا ہے، وہاں جا اور اجیر میں سکونت اختیار کر خدا کی مدد سے دینِ اسلام تیرے اور تیرے ارادتمندوں کے تقویٰ سے اس سرزمین میں پھیل جائے گا۔“

چنانچہ آپ نے اجیر کو اپنا مرکز بنایا، راجپوتانہ اور ملحقہ علاقوں میں تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دیں، نتیجہ یہ نکلا کہ بشارت کے مطابق ہندوستان نورِ اسلام سے حکمگاہا اٹھا اور سلسلہ پشتیہ کو مقبولیت نصیب ہوئی کہ کسی دوسرے کے لیے ایسی مقبولیت شاید و بائد،

قال میں تاثیر اور حال میں کشش کا یہ عالم تھا کہ جس طرف نظر اٹھ جاتی نکام کر جاتی جانا گئے کوچے بسا آئے، پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں:-

”جب آپ اجیر جاتے ہوئے راستے میں دہلی ٹھہرے تھے تو وہاں آپ نے ساتھ سو ہندوؤں کو مسلمان کیا تھا۔“

آپ کے سلسلہ عالیہ سے منسلک اور آپ کے محبوب و مقرب خلیفہ خواجہ بختیار کاکلی کے فیض یافتہ اور مشور بزرگ خواجہ سرید الدین گنج شکر نے پنجاب کی سولہ قوموں کو مسلمان کیا۔

خواجہ فرید اللہ آپ کے خلفاء و خدام کی تبلیغی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے  
پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع رقمطراز ہیں۔

شیخ فرید الدین گنج شکرؒ اور آپ کے مریدوں کی سعی مشکور سے تمام  
پنجاب نور اسلام سے منور ہو گیا۔ سیال جو پنجاب کے مغربی میدانی علاقے  
کی نہایت اہم اقوام میں سے ہے اور غالباً پنوار راجپوت ہیں ان کا مورثہ  
اعلیٰ پاک پٹن میں جناب بابا کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لایا اور اُس  
کی قوم نے بھی اسلام قبول کیا، سیال قوم جنگ، ملتان، گجرات، مظفر گڑھ  
اور دیگر اضلاع میں پھیلی ہوئی ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی خدمات دین کو ایک ہندو مفکر رائے بسا اور  
ہر بلاس شلہ واکس نظر سے دیکھتا ہے، اس کی رائے پڑھیے۔

خواجہ معین الدینؒ نے پرہیزگاروں کی زندگی بسر کی۔۔۔ انہوں نے  
زیادتی کرنے کی تمہین کبھی نہیں کی اور خدا کی تمام مخلوقات کی نسبت اُن  
کا نقطہ نظر صلح اور خیر خواہی کا تھا۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کا سلسلہ اس قدر وسیع اور موثر تھا کہ ہندوستان کا  
کوئی کونہ ایسا نہ رہا جہاں آپ کے خلفاء خدام اور فیض یافتہ افراد نہ پہنچے ہوں اسلام  
کی تبلیغ کا حق ادا نہ کیا ہو، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدینؒ اور دونوں  
اہل دل بزرگوں نے اس معاملے میں جس دلچسپی اور اہتمام کا مظاہرہ کیا، برصغیر کا  
ایک ایک مسلمان بچہ ان کا ممنون و مشکور ہے، گجرات، دکن، اور بنگال میں جو بزرگ  
اسلام لے کر گئے ان میں مولانا حسام الدین عتائیؒ مولانا کمال الدینؒ، شیخ برہان الدین  
غریبؒ اور مولانا سراج الدین عثمانؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ سب بزرگ خواجہ نظام الدین  
چشتیؒ کے خلفاء میں سے ہیں۔

شیخ ابواسحاق گازرونی کی تیسری و اصلاحی کوششوں کا کوئی احاطہ نہیں، نہ جانے ان آنکھوں میں وہ کونسی مقناطیسیت بھری تھی کہ جس جانب اٹھتیں، پروں کے پرے کھینچے آتے، جنہوں نے ایک بار ان کی جلالت گفتار کا مزہ چکھا، زندگی بھر شہد کی مٹھا یاد نہ آئی، ہزاروں نمونوں اور ترانوں میں وہ سرور کہاں جو ان کے بے تکلف الفاظ میں ہوتا تھا، ہزاروں کتابیں وہ کچھ نہ کر پائیں جو ان کے ایک جملے نے کر دکھایا، بغیر حلہ کھینچے تیر کا کعب جانا یہ معنوم ان کی محفل میں سمجھ آیا، اٹھی، گرمی اور بیٹھ گئی پھر کیا ہوا، دل کی کاپی پلٹ گئی، خزینۃ الاصفیاء کے مولف کی گواہی ملاحظہ کیجئے۔

”شیخ گازرونی کے دستِ حق پرست پر چوبیس ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور ایک لاکھ کے قریب مسلمان تائب اور حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔“

اقبال نے سچ کہا ہے۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہے تو دیکھ ان کو

یدِ بیضیا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

شیخ اسماعیل جن کا ذکر ہم پہچنے کر آئے ہیں ۱۲۵۰ھ میں لاہور تشریف لائے، ان کی مجلس میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا اور ہر روز صد ہا لوگ خلعت اسلام سے مشرف ہوئے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو آپ کو تراذو اکثر شیخ اکرام مطبوعہ فیروز سنز ص ۵۷

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سید جلال الدین بخاری کی آمد بہت اہمیت رکھتی ہے، اوچ کی قدیم اور تاریخی خانقاہ کی بناء آپ کے ہاتھوں ہوئی، اس جگہ میں منگل آپ کے دم قدم سے ہوا، اوچ کا قبیلہ ایک عظیم روحانی اور سیاسی مرکز بنا رہا، آپ تقریباً ۱۲۴۲ھ میں اوچ تشریف لائے اور آتے ہی روحانی و علمی فیض کا چشمہ جاری کر دیا، دور دراز سے لوگ آتے رہے اور فیضیاب ہوتے رہے، اس خانقاہ سے



نہ جانے کتنے تبلیغ کام، شاد کام، کتنے تشناب سیراب، کتنے گم گشتہ راہ راہ یاب اور کتنے محروم فیضیاب ہوئے، آپ کے روحانی اثرات دور دور تک محسوس کیے گئے آپ کے پوتے سید احمد کبیر المعروف مخدوم جہانیاں جہاں گشت گئے پنجاب کے کئی قبیلوں کو مسلمان کیا تھا۔

حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے بنگال میں قدم رکھتے ہی اپنی سرگرمیوں کا آغاز کس طرح کیا؟ پروفیسر محمد ایوب قادریؒ لکھتے ہیں۔

”ہاں رشد و ہدایت کا ہنگامہ برپا کر دیا، خانقاہ اور مسجد کی تعمیر کی اور لشکر خانہ جاری کر دیا، بہت سے مسلمان حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور خاص طور پر وہ ہندو اور بدھ جو نہایت پستی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے، حضرت تبریزیؒ کے ہاتھوں مشرف باسلام ہوئے“۔

حضرت ابو علی قلندر جو عراق عجم کے رہنے والے تھے، تیرھویں صدی کے اخیر میں پانی پت اگر سکونت اختیار کی اور سو سال کی عمر پا کر ۳۲۷ھ میں انتقال کیا، آپ نے اپنے مواعظ حسنہ سے خواص و عوام دونوں کو متاثر کیا اور اس حکمت و محنت سے تبلیغ اسلام کا کام کیا کہ دونوں میں معاشرے کا رنگ بدل گیا، اور امر کی پیروی اور نواہی سے اجتناب کا دور دورہ ہونے لگا، ایک طرف غیر مسلم حلقہ اسلام میں داخل ہونے لگے اور دوسری طرف مسلمانوں میں جو معاشرتی اور اخلاقی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کا استیصال شروع ہو گیا۔

پروفیسر ضیاء الدین برنی کے الفاظ میں :-

شیخ کے مبارک وجود، ان کے انفاس پاک کی برکت اور ان کی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت، تصوف اور زہد کی طرف مائل اور شیخ کی ارادت کی طرف راغب ہو گئے، سلطان علاء الدین

اپنے تمام گھروالوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہو گیا تھا خواص و عوام کے دل نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہدِ علانی کے آخری چند سالوں میں شراب و شاہد، فسق و فجور، قمار بازی، فحاشی کا نام بھی آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پایا، اب کبیرہ گناہ مسلمانوں کو کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے، مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سو خوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا ترکیب نہ ہو سکتے تھے اور خوف کے مارے دکانداروں سے جھوٹ، کم تولنے اور ملاوٹ کا رواج اٹھ گیا تھا۔<sup>۱۰۴</sup>

حضرت مجدد الف ثانی جن کا نام حریت و حق پرستی کا مراد و المعنی لفظ بن گیا ہے آپ کے صاحبزادے اور روحانی میراث کے وارث خواجہ محمد معصوم سرہندی المتوفی ۱۰۹۶ھ کے ہاتھ پر نولاکھ انسانوں نے بیعت اور توبہ کی۔<sup>۱۰۵</sup>

صدر الصدور شیخ عبدالنسی جو دور اکبری کی عظیم علمی اور روحانی شخصیت گزرے ہیں، آپ نے جس جرات، محبت اور دلسوزی سے اسلام کی تبلیغ، ادا امر کی ادائیگی اور نواہی سے پرہیز کی تلقین فرمائی اسے تاریخ اسلام میں ممتاز مقام حاصل ہے، آپ کی تلقین کا اثر تھا کہ اکبر بادشاہ (مغل اعظم) نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف اذان خود دیتا اور مسجد کی صفائی خود کرتا تھا۔<sup>۱۰۶</sup>

حضرت شاہ غلام علی المتوفی ۱۲۴۰ھ، جو پہلی صدی کی ایک ممتاز روحانی شخصیت ہیں، خانقاہ مجددیہ دہلی میں بیٹھ کر حق کی شمع فرزوں کی اور طالبانِ صادق پر روانے کی طرح کھینچے چلے آئے، اگر اقبال کے شعر کا جامہ کہیں راست آتا ہے تو بلاشبہ شاہ غلام علی کی قامت پر آتا ہے، سہ

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں  
فقط یہ بات کہ پیرِ مغان ہے مردِ خلیق

چشم دیدگواہوں کا بیان ہے کہ آپ کی خانقاہ میں پورب اور پچیم اور مغرب اور مشرق کے لوگوں کا ہجوم رہتا، بلا مبالغہ تیسوں شہروں کے ارباب ارادت بیک وقت آپ کی مجلس میں موجود رہے اور آپ کی مجلس پر میلے کا گمان گزرتا سرسید احمد خان آثار الضادید کے باب چہارم میں اپنی آنکھوں دیکھی کہانی بیان کرتے ہیں۔

میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر سعیت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ طبری دل کی طرح اُنڈتے تھے۔

حضرت شاہ روف احمد مجددی دارالمعارف میں صرف ایک روز کے طالبین کے مقامات کی فہرست میں لکھتے ہیں جو ۲۸ جمادی الاول ۱۲۳۱ھ کو دہلی کی خانقاہ مجددیہ میں استفادہ کے لیے حاضر تھے، اب شہروں کے نام ملاحظہ فرمائیے۔

سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امرتسر، سنبھل، رامپور، بریلی، لکھنؤ، گورکھ پور، عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدرآباد، پونہ وغیرہم۔

اب ہم آئیں، خاورِ تصوف کے رخشندہ آفتاب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تبلیغی کوششوں کا مختصر جائزہ لے کر اپنے عنوان کو ختم کرتے ہیں حضرت شیخ نے تحریر اور تقریر دونوں سے اسلام کی جو گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں ان کی گھن گرج ہزار سال گزرنے کے باوجود برقرار ہے، اگر مقبولیت نام اور محبوبیت عوام کو کسی کی عظمت و بہرہ و عزیزی کا معیار مان لیا جائے تو حضرت شیخؒ کی ذات اس

پر پوری اترتی ہے، کسی کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ آپ کی آمد اسلام کے افسردہ چمن میں بادِ بہاری کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے ہر گل رنگ و بلو میں نہا گیا، اس مرد قلندر نے ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر وہ کچھ کیا جو تخت و سیر پر بھی انجام نہ پاسکتا، آپ ہی کی نظر کا اعجاز اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ مندی آنکھیں بیک بیک کھل گئیں، کانوں کا بوجھ ہٹکا ہو گیا، دل کا غلاف اتر گیا، لغزیدہ قدم سنبھل گئے، بہکی فکر سدھ گئی، دھندلا ذہن صاف ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظر حق نما، کان حق آشنا اور دل خود آگاہ بن گئے، ایک زمانہ گواہ ہے کہ حضرت شیخ کے ہاتھوں قطرے دریا اور ذرے صحرا بن گئے، بے راہ ہادی اور مردے میجا بن گئے، یہ داستان کسے یاد نہیں، مال لوٹنے آئے تھے دل لٹا بیٹھے۔

حضرت شیخ کے معتمد اور ممتاز شاگرد حضرت عبداللہ جبانی روایت کرتے ہیں۔  
حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے۔

ایک لاکھ آدمیوں سے زیادہ عیاروں اور ڈاکوؤں نے میرے ہاتھ پر توبہ کی اور پانچ ہزار سے زائد یہودی مسلمان ہوئے۔

مندرجہ بالا دلائل اور حوالجات کے ہوتے ہوئے یہ بات کتنی بے وزن ہو جاتی ہے کہ صوفیاء کی زندگیاں گوشہ نشینی اور عزت نشینی میں گزریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام محتاج تکمیل رہا مگر صوفیاء، زیادہ عباد اپنے مراقبوں میں مست رہے، کفر و باطل کا تسلط بڑھتا رہا۔ مگر ارباب تصوف حق ہو کی ضروریوں میں مشغول رہے، لوگ دین سے دور ہوتے چلے گئے لیکن اصحاب طریقت دنیائے کشف و کرمیت میں کھوئے رہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جملہ اہل اسلام ان بے نوائف و نفعیروں کے ممنون احسان ہیں جن کے صدقے ان کے دل نور اسلام سے منور ہوئے ورنہ کیا خبر آج ہم کسی مند

میں دیوی کے چرنوں میں آلتی پالتی مارے بیٹھے اس کی ڈنڈوت بجالارہے ہوتے۔  
 پہلے سے قائم شدہ زائے کا کوئی علاج نہیں ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ان  
 فرقہ پوشوں نے سختی اور نرمی، سردی اور گرمی میں جس جاں سوزی کے ساتھ  
 لوگوں کی تعلیم و تربیت، اصلاح عقائد و اخلاق اور تزکیہ قلب و نفس کا اہتمام  
 کیا اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کی زندگی محض سانس کی آمد و شد نہ تھی بلکہ  
 ایک پیکار مسلسل تھی، باطل کے خلاف، کفر کے خلاف اور فساد کے خلاف، جہد  
 مسلسل تھی، سر بلندی حق کے لیے اور رب کعبہ کی قسم وہ اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

<http://t.me/Tehqiqat>

## آئینِ جوانِ مرزاں حق گوئی و بے باکی

اپنوں اور غیروں کے قلم اور کلام کی تان یہاں اگر ٹوٹتی ہے کہ مذہب تصوف انسان کو ترک و تحسرو، گوشہ نشینی، عافیت پسندی، زندگی سے گریز، مسائلِ حیات سے فرارِ رہبانیت، سہل کوشی اور یاس و ناامیدی کی تعلیم دیتا ہے اربابِ تصوف سرسریب اپنے من میں مست رہتے ہیں انہیں معلوم نہیں کہ مسائلِ زندگی کیا ہیں؟ تمدنی و معاشرتی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ نظامِ مملکت کیسے چل رہا ہے، معاشرے میں کہاں کہاں اور کون کون سی خرابیاں رونما ہو چکی ہیں؟ ان کا سدِ باب کیسے ممکن ہے؟ رعایا کے حقوق کیا ہیں اور سربراہِ مملکت کے فرائض کیا ہیں؟ امر بالمعروف کی دین میں اہمیت اور نہی عن المنکر کی وقعت کیا ہے؟ غرض ایسے سوالات پیدا کیے جاتے ہیں جو سارے نہیں تو اکثر یا تو اپنے دماغ کی اختراع ہوتے ہیں یا غلط فہمیوں کی پیداوار، کہا جاتا ہے، صوفیاء اپنے جھوپٹوں میں رہے، انہیں کیا معلوم اربابِ حکومت عوام پر کیا مظالم ڈھا رہے ہیں؟ وہ حق ہو کی گردانوں میں مصروف انہیں کیا خبر کہ حدودِ الشکر کو کس بیدردی سے پامال کیا جا رہا ہے؟ وہ مجاہدوں و مکاشفوں میں منہمک، کیا جانیں کہ اقامتِ دین کی تحریک اور اس کے تقاضے کیا ہوتے ہیں؟ وہ طویل قیام و سجود اور رکوع و تشهد میں مشغول، انہیں کیسے پتہ چلے کہ جہادِ زندگی کیا ہے؟ یہ ہیں وہ باتیں جو لمبے اور پیرائے بدل کر اور ٹیٹا ٹیٹ

کر کسی جاتی ہیں۔

کاش! اعتراض کرنے، الزام دھرنے اور منفی فیصلہ کرنے سے پہلے صوفیا، کرام کی زندگیوں کا بھرپور مطالعہ کیا ہوتا اور اصل ماحول کی طرف رجوع کیا ہوتا، پھر پتہ چلتا کہ کتیا میں رہنے والے ان بزرگوں نے کتنے ایوالوں میں زلزلے رہا کیے، ان ترقی پزیروں نے کتنے سریراؤں کو لرزہ براندام کیا، ان کی عقابانی نگاہوں نے کن کن کا پتہ پانی کیا حق کے ان غیور و جسور فقیروں نے کتنے بادشاہوں کے چہروں پر شکنیں ابھاریں، ان جانباز اور سرسروش مجاہدوں نے پروانے کی خاموشی کیساتھ کس اداسے اپنی جانیں نذر محبت کیں، یہ لوگ پایادہ سکندرانہ جلال اور قلندرانہ ادائیں لے کر کہاں کہاں پہنچے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا، کن زہرہ گداز اور جگر پاش حالات سے گذر کر انہوں نے حق کا علم بلند کیا، کتنے ایسے کج کلاہ ہوئے جن کی تندی و نخوت کو اپنے پاؤں پر رکھا، سینکڑوں واقعات ہیں جہاں ان بزرگوں نے گردن جھکانے پر کٹوانے کو ترجیح دی، لیکن یہ حقائق تو اس وقت اپنی اصل شکل میں ہمارے سامنے آتے جب ہماری آنکھوں پر رنگین شیشے نہ ہوتے جہتِ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ نہ صرف "جہادِ زندگانی" کی اصل رمز سے آگاہ تھے بلکہ ان کی زندگانی سراسر جہاد سے عبارت تھی، جہاں انہوں نے گلی کوچوں میں تبلیغ و نصیحت کی وہاں بڑے بڑے ایوالوں میں بھی آوازہ حق بلند کیا اور اس قوت، شدت، اخلاص اور بے نیازی سے حق کا پرچار کیا کہ انبیاء کی سیرتیں نظروں میں گھوم گئیں، دل میں وہی جذبہ، نظروں میں وہی بے باکی، چہرے پر وہی اعتماد و سکون، زبان پر وہی کھڑے جملے، بیان میں وہی ططنہ، انداز میں وہی ولولہ، عمل میں وہی اخلاص، طبیعت میں وہی قناعت و توکل اور چال و حال میں وہی بے نیازی جو منصب نبوت کے مابین کی سیرتوں میں دکھائی دیتی ہے انہوں نے نہ صرف بگڑے نوابوں، بدست جاگیرداروں

جابر و ظالم بلو شاہوں، بے لگام حکمرانوں، نخوت و کبر میں چور رئیسوں، عیش و عشرت میں غرق ہمارا جوں اور بے ضمیر وزیروں کو لٹکارا اور برسرا عام لٹکارا بلکہ ان کی تنقید کا ہدف وہ علما بھی بنے جو اپنے عالی منصب سے فروتر، بادشاہوں کی کارہیسی اور جاگیرداروں کی خوشامد کو اپنا دین سمجھے ہوئے تھے، ان فقہاء پر بھی برسے جنکی قبائلی اُن کے فتویٰ فزوشی کے باعث بے گناہ خون سے لہترتی ہوئی تھیں، ان مفتیوں کا تعاقب کیا، جن کی حیلہ جوئیوں، دسیہ کاریوں اور فریب سازیلوں کی وجہ سے دین بازیچہ اطفال بن کر رہ گیا تھا، اُن زاہدوں کی بھی خبر لی جو کج خمولی میں مسائل زندگی سے بے خبر تصور تھی دنیا میں گم گم تھے، جنہیں کسی بیوہ کے سر سے دوپٹا اترنے، کسی کی بیٹی کے پیر بننے، کسی یتیم کے ابرٹرنے اور کسی غریب کے لٹنے کا کوئی احساس نہ تھا وہ خطیب بھی ان کی حق گوئی کی سان پر چڑھے، جن کے خطبے خشک، دغظ بے تاثیر، تقریریں بے روح اور مقلد بے جان تھے، جن سے نہ آنکھوں میں عشق کا سرور اور نہ چہرے پر یقین کا نور پیدا ہوتا، المنحصر صوفیوں کا مقدس گروہ جہاں جہاں پہنچا، تبلیغ و نصیحت کا حق ادا کرتا، حق گوئی کے پرچم گاڑتا، بیباکی کے پھریرے لہراتا اور اخلاص سوز کے نشانات چھوڑتا گیا۔

صوفیاء کرام کو جہاں کوئی خلاف شرع کام نظر آیا فوراً ٹوکا، جہاں قرآن و سنت سے تجاوز کا رجحان دیکھا سیدراہ بن گئے، جہاں بدعت کو سراٹھاتے پایا۔ وہیں کچل دیا، جہاں کوئی بات دین اسلام کے منافی سامنے آئی اس کے استیصال کی بھرپور کوشش کی، جب بھی اور جہاں بھی محسوس کیا کہ خدا کی حدود اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو نظر انداز کیا گیا ہے، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کون اس فعل کا مرتکب ہے، فوراً پیام زبان سے شمشیر حق نکالی اور نخوت و کبر سے بھرے کلاہ داروں انا نیت و غرور سے سرشار عامہ پوشوں، کروفر کے نشے میں



دھت سر پر آراؤں کی اکڑی گز نہیں ہو ایسے اچھا دل اور ان کی تندی خاک میں ملا دی، جب اور جہاں موقع ملا حق کی بات سنا دی، بادشاہوں کو مرصع اور مست ہاتھیوں پر زندگار ہودج میں بیٹھے خدام و ختم کی فوج کے جلو میں سیر کرتے دیکھا تو میں پیغام حق نشر کر دیا، بھرے وزیر میں چوہداروں کے درمیان تخت و تاج سے آراستہ و پیراستہ جلوہ افروز دیکھا تو حق بات کہنے میں تامل نہ کیا، بادشاہوں نے بلوا کر نصیحت چاہی تو چلے گئے، اگر انہوں نے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں تو بھی دروازوں پر دستک دے آئے، حق کوئی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا، تو بہر طور نبھایا خواہ کوسے یار میں موقع ملایا سوئے دار جانا پڑا، اب ہم ان تاریخی حقائق کا حساب لڑہ لیتے ہیں جن سے یہ معلوم کرنا آسان ہو جائے گا کہ واقعہ صوفیاء کرام نے تبلیغ حق اور نصح خیر کا فریضہ بڑی بے باکی اور جوانمردی سے سرانجام دیا اور حق کوئی و بے باکی کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی جو نظام مصطفیٰ کے علمبرداروں کے لیے بجا طور پر مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔

خواجہ فرید الدین عطارؒ نے لکھا ہے، ایک مرتبہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اپنے مستد وزیر فضل کے ہمراہ حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ کے در دولت پر حاضر ہوا، اور دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون؟ وزیر نے جواب دیا۔ "امیر المؤمنین" خواجہ فضیلؒ نے فرمایا، امیر المؤمنین کا مجھ سے کیا کام؟ اور مجھے ان سے کیا واسطہ؟ وزیر نے کہا بادشاہ کی اطاعت واجب ہے، فرمایا مجھے حیران نہ کرو، وزیر نے کہا اندر آنے کی اجازت دو، ورنہ ہم حکما اندر آجائیں گے فرمایا اجازت تو نہیں دیتا، حکما اندر آسکتے ہو چنانچہ خلیفہ اور وزیر اندر آ گئے، خواجہ فضیل نے چراغ گل کر دیا تاکہ ہارون الرشید کو نہ دیکھ سکیں، اسی اشارے میں ہارون کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے چھو گیا، فرمایا کیسا نرم ہاتھ ہے، کاش کہ دوزخ کی آگ سے بچ جائے، خلیفہ نے درخواست کی، کچھ

ہدایت فرمائیے، جو اب دیا، تیرا باپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا اس نے درخواست کی تھی کہ مجھے کسی صوبے کا حاکم بنا دیا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یا عم بک نفسک (یعنی اسے چچا تجھے تیرے نفس کا امیر کیا، ہارون الرشید نے کہا کچھ اور فرمائیے، فرمایا یہ ملک تیرا گھر ہے اور رعایا تیری اولاد، ماں باپ کے ساتھ ترمی، بہن بھائیوں پر مہربانی، بچے بچیوں سے نیک سلوک کر، اگر کوئی مفلس برٹھیارات کو بھوکے سو جائے گی تو قیامت کے دن وہ بھی تیری دامن گیر ہوگی اور تیرے ساتھ جھگڑے گی، لے

اس واقعے میں بیک وقت بادشاہوں سے بے نیازی، امر اور زرار سے بے رغبتی، مملکت کی ذمہ داریوں کو باحسن پورا کرنے کی تلقین، وعظ و نصیحت اور فکر آخرت نمایاں ہے، شفیق سے شفیق باپ بھی اتنی نرمی اور پیار سے بیٹے کو زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ نہیں کرتا ہوگا، جتنی شفقت اور محبت سے خواجہ فضل نے ہارون الرشید کی رہنمائی فرمائی، دینی اخوت، ایمانی ہمدردی اور انسانی مروت لفظ لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے، زبان سے ادا ہونے والا ہر حرف اخلاص و سوز لیے ہوئے اور انداز دامن میں اپنائیت سمونے ہوئے ہے، رہا یہ سوال کہ خلیفہ وزیر کے آنے پر دروازہ نہ کھولنا یا اندانے کی اجازت نہ دینا اخلاق و مروت کے خلاف ہے، تو اس کے بارہ میں بادی نامائل تہہ تک پہنچا جاسکتا ہے کہ فقیروں کے وہ دروازے جو ہر اپنے غیر کے لیے ہر وقت کھلتے، ہر عامی و خاص کے لیے دہکتے ہیں وہ ہارون یا فضل پر کیسے بند ہو سکتے ہیں لیکن اس میں تبلیغ و نصیحت کا پہلو تھا اور یہ باور کرانا مقصود تھا کہ حق کے علمبردار کبھی قریب شاہی کے لیے بے قرار نہیں ہوتے، یہی وہ بے نیازی ہے جو بات میں قند و نبات، اور قنوت میں شہد و شیر کی مٹھاس بھر دیتی ہے اور دل کے لوبے کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب

کھینچ لیتی ہے، یوں ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے ہیں، اس واقعے کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس الزام میں کتنا وزن باقی رہ جاتا ہے کہ صوفیاء کرام کو ملک اور ملکی حالات کی کچھ خبر نہیں ہوتی، لہذا کہ انہیں دلچسپی ہو، عباسی خلافت ہی کے ایک تاجدار خلیفہ المنصور کا واقعہ ہے، حضرت سفیان ثوریؒ نے حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں خلیفہ المنصور کو پکڑ لیا اور کہا۔

”امیر المؤمنین! حضرت عمرؓ نے ایک حج کے عام مصارف پر سولہ دینار خرچ کیے تھے، آپ نے خدا اور امتِ محمدیہ کا بے شمار مال بغیر اجازت صرف کیا ہے، آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ منصور لاجواب ہو گیا بعد میں انہیں (سفیان ثوریؒ) سلسلہ حکومت میں منسلک کرنا چاہا تو وہ روپوش ہو گئے۔“

نامور، ذمی جاہ، طاقتور اور باہمیت حکمران کے منہ آنے والا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والا، خلیفہ راشد ثانیؒ کے طریقے سے ہٹنے پر ٹوکنے والا، جو اب دہی کا احساس ابھارنے والا، امتِ محمدیہ کی امانت یاد دلانے والا اور منصبِ حکومت کو ٹھکرانے والا کون تھا؟ یہ اسی گروہ کا نامور فرزند تھا جو آج تک طعن و تشنیع کے چر کے سہتا آ رہا ہے کہ صوفیاء عاقبت کوش، خلوت پسند اور امور دنیا سے گریزاں ہوتے ہیں۔

ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر، پورے خراسان کا حاکم تھا، نمود و نمائش کا رسیا اور زرق برق لباس پہننے کا دلدادہ، جب نکلتا تو خدام و حشم کی فوج لے کر نکلتا، چوہداروں کی ایک جماعت ہٹو، بچو! کی صدا میں بلند کرتی، شاہانہ کرد و فرس اس کی ایک ایک بات سے ٹپکتا تھا، اسی نوع کی ایک تقریب میں امام غزالیؒ نے اسے خطاب کر کے کہا۔

افسوس! مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوقہائے زریں کے بار سے بڑھتے

امام غزالیؒ بھی ان جفاکشان و ستم رسیدگان میں سے ہیں جن کے مذہب کو "عزیمیت" کے بجائے "عافیت" کا مذہب کہا جاتا ہے، آج امام غزالیؒ سلطان بخر کے منہ آیا ہے، کل ہی غزالیؒ جامعہ نظامیہ (بنداد) میں قاتل اقول کی بحثوں میں مصروف، منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے میں مشغول، علم کلام کے قضیوں اور کلیوں میں منہمک اشاعرہ و معتزلہ کے نظری مسائل میں محو تھا، یہ وہ زندگی تھی جو حریموں کے بقول معاملات زندگی میں دلچسپی سے بھرپور زندگی تھی، معاشرتی و منصبی ذمہ داریوں کے احساس سے معمور زندگی تھی، مگر کتب کی فضا سے باہر غزالیؒ نے کیا کیا تھا؟ حق گوئی کا داعیہ ابھرا، امر بالمعروف کا جذبہ اٹھا، منی عن المنکر کا ولولہ پیدا ہوا تو کب؟ جب غزالیؒ قرقر پوشوں کی صف میں شامل ہوا اور درویشوں کے کدواں سے آطا۔ خود آکاہی کے آداب، فلسفہ و منطق نہیں عشق سکھاتا ہے اور یہی عشق ان بے لواؤں کا سرمایہ حیات اور حاصل زندگی ہے، یہی عشق دنیا کی تنگ و تاریک وادیوں سے نکال کر دین کی سرسبز و شاداب اور وسیع روشوں پر چلنا سکھاتا ہے، غزالیؒ کے پہلے دور میں فلسفہ اور اس دور میں تلقین نمایاں ہے۔

جب بھی صوفیاء کرام نے دیکھا کہ اقتدار کی امانت کو نا اہل ہاتھوں کے سپرد کیا جا رہا اور عوام کی گردنوں پر فاسق و فاجر کو بٹھایا جا رہا ہے تو ان کا ردِ عمل کیا تھا؟ اس سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ایک واقعہ ہماری بہترین رہنمائی اور حقیقت حال کی وضاحت کرتا ہے، جب خلیفہ معتضی لامر المتمدن نے قاضی ابوالوفاء یحییٰ کو منصب قضا سونپا، تو اس واقعہ پر احتجاج کرتے ہوئے ایک اجتماع میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے برسرِ منبر خلیفہ کو سخت الفاظ میں مخاطب کر کے

فرمایا :-

”تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے، جو اظلم الظالمین ہے، کل قیامت کے دن اس رب العالمین کو جو ارحم الراحمین ہے کیا جواب دو گے۔“

شیخ عبدالقادر جیلانی کی شخصیت جہاں، متنوع، ہمہ جہت اور عظیم ہے وہاں کاروانِ ولایت کے سالار کی حیثیت رکھتی ہے، ہزاروں انسانوں جتنا کام اس مردِ خدا نے تنہا ماحول کی ناسازگاری اور باوجود مخالفت کی تندی کے باوجود کر دکھایا افسوس کہ اس مردِ مولا کو جہاں زندگی میں فضا سازگار مہیر نہیں آئی وہاں وفات کے بعد بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، آپ کی کرامات کے چرچے تو زبانِ زدِ عام و خاص ہیں مگر کسی کو خدمات کا علم شاید و باندھو، حالانکہ آپ کا وجود اسلام کے لیے بادِ بہاری تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں غنچے کھلا دیے اور علمِ اسلام میں ایمان اور روحانیت کی نئی لہر دوڑ گئی، آپ نے اگر ایک طرف بادشاہوں کا دامن پکڑ کر چھوڑا تو دوسری جانب ان عمامہ پوشوں کا تعاقب بھی کیا، جن کی علمی و اخلاقی کمزوریوں کے باعث سلاطین و حکامِ دین کے معاملہ میں جبری اور بے خوف ہو گئے تھے، ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرمایا۔

”اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو، تمہیں ان سے کیا نسبت ہے اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو! اے راہزنو، تم کھلے ظلم اور نفاق میں مبتلا ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے عالمو، اے زاہد و شاہانِ سلاطین کے لیے کب تک منافق بنے ہو گے، کہ ان سے دنیا کا زرو مال اور اس کی شہوات و لذات لیتے رہو، تم اور اکثر بادشاہ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظلم اور

خائن بنے ہوئے ہیں۔“

شیخ کے اس خطاب میں اسلام کی غیرت، ایمان کی حمیت، مسلمانوں کی فلاح کی تڑپ، راہِ حق سے ہٹے ہوؤں کی اصلاح کے لیے بے قراری، تفاق و بندگی، زرد مال اور کتمانِ حق کے استیصال کے لیے بے چینی، آسانی ملاحظہ کی جاسکتی ہے، شیخ برہان الدین غریبؒ کے خلیفہ شیخ زین الدینؒ (م : ۱۸۰۱ھ) کے معاصر والی دکن سلطان محمد شاہ بہمنی کا دور عروج و اقبال ہے اور اسی رو میں منہیات شرعیہ کا ارتکاب کر بیٹھا، جس پر شیخ زین الدینؒ نے افسوس، غصے اور قلق کا اظہار فرمایا، ۱۷۶۷ء میں جب سلطان فاتحانہ دولت آباد میں داخل ہوا تو حضرت شیخ کو پیغام بھیجا، یا تو آپ خود دربار میں حاضر ہوں، یا میری خلافت کی تحریر اپنے دستِ خاص سے میرے پاس بھیجیں، شیخ نے چونکہ سلطان کو منہیات شرعیہ کا مرتکب پایا تھا اس لیے نہ حاضری روا بھی نہ تحریر خلافت جائز جانی، بہر حال جواب دینا تھا دیا، وہ ملاحظہ کیجئے یہ جواب، حق کے میاگانہ اظہار و عطا و نصیحت، تفسیر و تفہیم اور بے نیازی پر مشتمل تھا، آپ نے پہلے ایک حکایت سنائی پھر اپنا مدعا ظاہر فرمایا:

”ایک مرتبہ کسی تقریب سے ایک عالم، ایک سید اور ایک سچڑا کافروں کے ہتھے چڑھ گئے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں بت خانہ میں لے چلیں، جو بت کو سجدہ کرے گا اس کی جان بخشی کر دی جائے گی پہلے عالم کو لے گئے، انہوں نے (اضطراری حالت میں) قرآن مجید کی رخصت پر عمل کیا، اور بت کو سجدہ کر کے جان بچالی، سید نے عالم کی پڑی کی جب سچڑے کی باری آئی، اس نے کہا، میری ساری زندگی ناشائستہ کاموں میں گذری، میں نہ تو عالم ہوں اور نہ سید کہ ان میں سے کسی فضیلت کی پناہ میں ایسا کام کروں۔ اس نے قتل ہو جانا منظور کر لیا

مگر بت کو سجدہ نہ کیا :-

حکایت سنانے کے بعد آپ نے لکھا: "میرا قصہ بھی اس میں میرٹے کے قصے سے مشابہت رکھتا ہے میں تمہارے ہر ظلم کو برواشت کرونگا لیکن نہ دربار میں حاضر ہوں گا نہ تمہارے ہاتھ پر سعت کرونگا۔"

بادشاہ کو سخت غصہ آیا اور شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ نے بلا توقف اپنی جائے نماز کا ندھے پر ڈالی اور اپنے مرشد شیخ برہان الدین کے مقبرے میں جا کر ان کی قبر کی پائنتی اپنی لالٹھی گاڑی اور جانے مار بھا کر بیٹھ گئے اور کہا اب کوئی مرد ہو تو مجھے اپنی جگہ سے ہلائے، بادشاہ نے شیخ کی استقامت دیکھی تو سخت شرمندہ اور پشیمان ہوا اور اپنے ہاتھ سے یہ مصرعہ لکھ کر شیخ کی خدمت میں صدر شریف کے ہاتھ بھجا :-

من زان توام تو زان من باش  
شیخ نے فرمایا اگر سلطان محمد شاہ غازی شریعت کے طور و طریق کی حفاظت و ترویج کی کوشش کرے اور ممالک محروسہ سے شرب خانے تک قلم اٹھا دے اپنے باپ کی سنت پر عمل کرے اور قضاة، علماء اور صدور کو حکم دے کہ وہ اسر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سعی بلیغ سے کام لیں تو فقیر زین الدین سے بڑھ کر بادشاہ کا کوئی خیر خواہ اور دوست نہ ہوگا اور یہ اشعار اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائے۔

تا من بزیم بجز نکوئی نہ کنم      جز نیک دلی و نیک خوئی نہ کنم  
آنا کہ بجائے بہ بیسا کردند      تا دست رسد بجز نکوئی نہ کنم

سلطان محمد تعلق جب دم توڑ رہا تھا تو جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا، کافی دیر بحث و تمحیص ہوئی، اعیان مملکت کی مختلف آراء تھیں، بالآخر فیروز تعلق کی جانشینی پر اتفاق ہوا، اس میں خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی رائے بھی شامل تھی اور اس

فیصلے میں آپ بھی شریک تھے، جب باقاعدہ حلف برداری اور تاج پوشی کی رسم ادا کی جانی تھی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو پیغام بھیجا، تم وعدہ کرو کہ اپنے خلق سے مخلوق کے ساتھ عدل و انصاف کرو گے ورنہ ان سب کے بندگان خدا کے لیے دوسرا فرمانروا طلب کیا جائے، سلطان فیروز تغلق نے جواب دیا۔

”میں خلق خدا کے ساتھ علم و بردباری سے پیش آؤں گا اور اتفاق و محبت سے ان پر حکمرانی کروں گا۔“

یہاں انصاف کی نظر چاہیے جو دیکھے اور صحیح فیصلہ دے کہ آیا صوفیا کرام آنکھوں پر پٹی باندھے اور کانوں میں تیل ڈالے، محض چلوں اور مراقبوں میں مصروف رہتے تھے یا فرمانروایان مملکت سے بڑھ کر عوام کی فلاح و بہبود اور ملک میں ظلم و ستم کے امتیصال کے لیے کوشاں اور فکر مند رہتے تھے، بادشاہ سے خلق خدا کے ساتھ علم و بردباری کے سلوک کی ضمانت امور دنیا میں دلچسپی اور عامۃ المسلمین کے معاملات سے گہری رغبت کی غماز ہے یا ان سے اعراض و تسامح کی ترجمان، اور پھر یہ کہ صوفیا کرام باوجود اس کے کہ سرکار، دربار سے ہمیشہ دور رہے مگر لے خبر اور غافل نہیں رہے، انہوں نے اگرچہ سرکار کی ملازمت اور نوکری نہیں کی لیکن نگہبانی اور نگران کا فریضہ باحسن طریق سرانجام دیا اور جب محسوس کیا کہ بادشاہ وقت جاہل و عدل سے ذرا سامٹ گیا ہے یا کسی درباری اور حاکم علاقہ کی چیرہ دستیوں سے عوام نالاں ہیں تو حق کہنے اور سمجھانے میں لمبے بھر کا تامل روا نہیں رکھا، اگر سننے والے گوش نصیحت نیوش تھے تو بہتر ورنہ مشکلات اور مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا اور خندہ پیشانی سے سامنا کیا، مصائب و مظالم خواہ کتنے ہی سخت کیوں نہ تھے مگر صوفیا جو افرادوں کے آئین سے ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہوئے اور آئین جو انہوں نے کیا ہے، بس انہی دو لفظوں سے عبارت یعنی حق گوئی و بے باکی!



اسی فیروز تعلق کے ایک وزیر خان تلنگی کا واقعہ ہے جو آپ کا بے حد معتقد تھا، وقتاً فوقتاً اظہار عقیدت کے لیے دربار میں حاضر ہوتا رہتا اور نیاز بجالاتا، جب وزیر باقاعدہ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوا تو اپنے مرشد شیخ نصیر الدین دہلوی سے عبادت و ریاضت کی تفصیل دریافت کی، جواب میں ذمہ دار اور حقائق پسند شخصیت کے مالک پیر نے تسبیح گردانی کا حکم نہیں دیا، سانس بند کر کے ذکر میں مشغولیت کی رائے نہیں دی، صائم الدھر اور قائم اللیل ہونے کی تلقین نہیں کی، کسی مخصوص وقت کسی مخصوص مجاہدے کی نصیحت نہیں فرمائی، چونکہ حق کہنے اور وعظ کرنے کا ذریعہ نے خود اچھا موقع ہتیا کر دیا، سو آپ نے اس سے فائدہ اٹھایا، ایک طرف وزیر کی جاہ و حشمت کو خاطر میں لائے بغیر لوری میا کی سے اسے کلمہ حق کہا اور دوسری جانب وہ کام بتایا جو تمام عبادات سے بہتر اور صوفیاء کرام کی تعلیمات کا خلاصہ اور لب لباب ہے یعنی خدمتِ خلق، آپ نے وزیر سے فرمایا: تم وزیرِ مملکت ہو، تمہاری عبادت یہی ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری میں انتہائی کوشش کرو، جب اس نے اور ادو و طالب کے لیے بے حد اصرار کیا تو آپ نے فرمایا، جہاں تک ہو سکے با وضو ہو اور جو کام کرو عبادت سمجھ کر کرو۔

سلطان شمس الدین التمش کی نیک خوئی، انصاف پروری، تقویٰ شکاری اور اولیاء دوستی سے زمانہ واقف ہے یہ بہ ظاہر بادشاہ باطن درویش، نرالے مزاج کا آدمی تھا، اچھے اوصاف اور بہترین خوبیوں کا مالک بادشاہ اولیاء اللہ کی نظروں میں محبوب تھا اور اسے بھی ان سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی، ملتان کے گورنر ناصر الدین قباچہ نے جب سلطان کے خلاف بغاوت کی تو شیخ بہاؤ الدین ذکر یا نے خط لکھ کر سلطان شمس الدین کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا، خطر راستے میں پکڑا گیا قباچہ سخت برا فرختہ اور بیخ پا ہوا، جب پرسش ہوئی تو نہ صرف آپ

نے خط لکھنے اور بھیجنے کا اقرار و اعتراف کیا بلکہ گورنر کو اس کی غلط روش اور فاسد ارادے آگاہ بھی کیا اور تنبیہ بھی جس سے مسلمانوں کو ناجائز تکلیف اٹھانے اور پریشان ہونے کے کچھ حاصل نہ ہوتا، آپ نے فرمایا۔

ہاں یہ خط میں نے لکھا ہے اور ارشادِ الہی کے مطابق لکھا ہے تمہاری (غلط) کوششوں سے سولے مسلمانوں کے خون بہنے کے اور کچھ نہ ہوگا۔ ۹

انہی شیخ بہاؤ الدین زکریا کے پوتے شاہ رکن عالم طسانی نے ایک موقع پر مسلمانوں کے خون بہانے سے بادشاہ کو روکا اور یوں لوگوں کی جانیں بچیں، واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ شلوخان نے سلطان محمد تغلق کے خلاف بغاوت کی سلطان نے اس بغاوت کو کچل دیا اور اہل ملتان کا خون بہانے اور قاضی شہر کی کھال کھینچنے کا حکم دیا، سلطان چونکہ آپ کا بے حد معتقد اور ارادتمند تھا، جب آپ کو پتہ چلا تو آپ فوراً بادشاہ کے پاس پہنچے، اسے نصیحت کے ساتھ تنبیہ بھی کی اور اس ظالمانہ ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے روکا، سفارش کی، اور اس طرح سے اہل ملتان کی جانیں بچائیں۔

ان واقعات سے کیا اسی صوفی کا خاکہ ابھرتا ہے جو تصوف کے ناقدین کے ہاں ملتا ہے، یعنی تحسیر و پسند، رہبانیت کیش، دنیا و مافیہا سے بے خبر اور عافیت کوش قسم کے صوفی کا خاکہ، یا ایسے صوفی کا تصور ذہن میں آتا ہے جو فی الواقع تصوف کی رو سے صوفی ہے، جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا بھی خیال رکھنے والا خالق سے واصل ہونے کے ساتھ ساتھ مخلوق سے بھی شافل ہے، جس کا دل تمام مسلمانوں کے ساتھ دھڑکتا ہے، جس کی زبان باطل کے خلاف شمشیر بے نیام کا درجہ رکھتی ہے جو شاہی محلوں میں آوازہ حق بلند کرنے والا اور حق کی حمیت و غیرت میں بادشاہوں

کے دامن پر ہاتھ ڈالنے والا ہے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م: ۱۱۵۳ھ) سلسلہ چشت کے نامور اور صاحب اثر بزرگ شمار ہوتے ہیں، آپ نے ہندوستان میں جن حالات میں کام کیا وہ بڑے ہی نازک اور کٹھن تھے، صوبوں میں خود مختاری کی لہر، مستحکم مرکزی نظام کے خاتمے، سلطنت دہلی کے زوال اور سماجی ڈھانچے کے بے جان ہونے کے باعث فضا غیر یقینی اور ماحول انتہائی دشوار اور نامسازگار تھا، آپ مشائخ چشت کے دستور کے مطابق سرکار و بار سے گریزاں اور قرب سلطان کو آتش سوزاں جان کر علاحدہ رہے، لیکن بایں ہمہ وقتاً فوقتاً ملکی حالات کی درستگی و اصلاح کے لیے کوششیں فرماتے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے، جب تک سکندر لودھی حکمران رہا اسے برابر انصاف پروری عدل گستری، خدمتِ خلق اور رعایا کے ساتھ نیک سلوک کی تلقین کرتے رہے جب خاندان مغلیہ کا بانی سلطان ظہیر الدین بابر سرریہ آرا ہوا تو انہوں نے مغل شہنشاہ کو بھی خط لکھا اور اس میں نہایت صاف گوئی سے اوامر کی پابندی اور لوہا ہی سے بھتاب کی نصیحت کے ساتھ ساتھ امراء، حکام و دیگر کلاہ پروازانِ مملکت کے اخلاق سدھ پر زور دیا تاکہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک پورا معاشرہ اسلامی سانچے میں داخل جائے، آپ نے اپنے مکتوب میں لکھا۔

”منعم حقیقی کے اس احسان پر اظہارِ شکر کے لیے ضروری ہے کہ پوسے ملک پر عدل و انصاف کا چتر بیج جائے اور کوئی شخص کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے، تمام رعایا اور فوج و سپاہ جملہ شرعی اوامر و لوہا ہی کی پابندی کریں، نماز باجماعت ادا کریں، علم اور اہل علم سے محبت رکھیں، ہر بازار اور قصبے میں محتسب مقرر کیے جائیں تاکہ کوچہ و بازار عدل شرع محمدی کے جمال سے سنور جائیں اور اس کے نور سے دشمن و

منور ہو جائیں جیسا کہ اسلاف کے عہد اور خلفائے راشدین کے دورِ  
ہمایوں میں تھا۔ ۱۸۲

آپ نے مغل شہنشاہ کے علاوہ بعض امرا مثلاً خواص خان بہمیت خان شیرانی  
کو بھی اس مضمون پر مشتمل خطوط ارسال کیے اور انہیں رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور  
عدل و انصاف قائم کرنے کی تلقین فرمائی، مغل اعظم جلال الدین اکبر بادشاہ ایک بار  
عالم شباب میں بن سالگرہ کی تقریب پر زعفرانی لباس پہن کر محل سرا سے باہر آیا  
تو شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے شیخ عبدالبنی نے سرور بارٹو کا اور اس شدت  
کے ساتھ ٹوکا کہ عشا کا سر بادشاہ کو جا لگا اور اکبر چپ ہو رہا۔ ۱۸۳

شیخ نور الدین مبارک ۱۰۴۲ھ: ۱۶۳۲ھ سلطان شمس الدین التمش کے دور میں  
دہلی کے شیخ الاسلام رہے مگر پھر سے دربار میں آزادانہ تنقید کرتے رہے۔ ۱۸۴

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی داستان عزیمت و استقامت  
سے کون آگاہ نہیں، جنہوں نے نہ صرف دربارِ شہی کی ایک غیر شرعی رسم پر تنقید کی  
بلکہ عملاً اس کی مخالفت کر کے عرصے تک قلعہ گوالیار میں محبوس و نظر بند رہے۔ سخت  
پر عزیمت کو ترجیح دی، اور حق گوئی و بے باکی کی نئی اور ولولہ انگیز تاریخ مرتب کر دی،  
بھی خواہوں کے مشوروں، اربابِ اقتدار کی دھمکیوں، ذاتی و خاندانی مصلحتوں اور  
دنیوی اور منجھبی رعایتوں کو بالائے طاق رکھ کر آوازہ بحق اس شدت سے بلند کیا کہ  
ایوان شاہی کی بنیادیں ہل گئیں، آپ کی عزیمت و استقامت نے جہاں عہدِ جہانگیری  
کو متاثر کیا وہاں بعد میں بھی دیر تک اس کے اثرات محسوس ہوتے رہے جو بدعتیں  
اور غیر شرعی رسمیں مغلیہ خاندان کے سب سے مضبوط اور طاقتور ترین حکمران کی نظر سے  
میں رائج ہوئی تھیں اور جن کی پشت پر اقتدار و سلطنت کی طاقت تھی، ایک فقیر خدا  
مست کی نولے حق نے ان سب پر خطِ قسح کھینچ دیا، جب آپ نے سلطان

نور الدین جہانگیر سے سجدہ تعظیمی کے مسئلہ پر اختلاف کیا اور بادشاہ کے موروثی ہدف ستم قرار پائے تو چھوٹے موٹے افراد چھوڑ کر شہزادہ شاہ جہان تک جو آپ کا متقد اور ارادتمند تھا آپ کو سمجھانے اور عتاب شاہی کی صورت میں مشکلات و مصائب بتانے میں پیش پیش تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ شیخ اس کے والد اور سلطانِ وقت کی اذیت سے محفوظ رہے، شاہ جہان نے اپنی طرف سے پوری تندرہی کے ساتھ کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح شیخ معالمت و معاہمت پر آمادہ ہو جائیں، لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک طرف اگر شہنشاہ طاقت و سلطنت کے نشے میں دھت تھا تو دوسری جانب شیخ بھی "حق کے نشے میں مست تھے، ادھر غرور تھا تو ادھر سرور تھا، میرا گروستور شاہاں کا پابند تھا تو فقیر بھی آئین جو انہر دان کا محافظ تھا، شہزادہ شاہ جہان نے ایک بار مقامی علماء، افضل خان اور خواجہ عبدالرحمن مفتی کو آپ کے پاس کتب فقہ دے کر روانہ کیا، تاکہ بوقت ضرورت جان کے خوف سے از رو مصلحت شریعت کی رخصت سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ کو سجدہ تعظیمی کریں آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: یہ مسئلہ ضعیف حکم رخصت ہے اور مسئلہ قوی عزیمت یہ ہے کہ غیر حق کو کبھی سجدہ نہ کریں "عزیمت و استقامت کے دیگر پہلوؤں سے آگاہی کے لیے ان کا مطالعہ کریں جو آپ نے میر نعمان اپنے صاحبزادوں کے نام لکھے، مکتوبات کی جلد سوم کے دوسرے مکتوب میں تفصیل دیکھی جائے۔

انہی شیخ مجدد کے صاحبزادے شیخ محمد معصوم سرمندی (دم: ۱۰۹۶ھ) نے جو آپ کے خلیفہ مجاز بھی ہیں، اپنے قابل فخر والد کے نقش قدم پر چلے ہوئے حق گوئی و بیباکی کی تائید میں زریں اضافہ کیا اور ان خطوط و نقوش کو مزید واضح اور روشن کر دیا۔ جب سلطانِ وقت اورنگ زیب عالمگیر نے حضرت خواجہ محمد معصوم سے التجا کی کہ اپنا کوئی خلیفہ میری ہدایت و توجہ کے لیے روانہ فرمائیں تو آپ نے اس درخواست پر اپنے

صاحبزادے سیف الدین (م: ۱۰۹۵ھ) کو دہلی بھیج دیا، چونکہ آپ نے حق گو طبیعت اور بیباک روح اپنے جدا جدا والد گرامی سے میراث میں پائی، چنانچہ اس کا مظاہرہ قدم قدم پر ہوا، دہلی پہنچتے ہی آپ نے پوری شدت سے اصلاح احوال و تعمیر اخلاق کا کام شروع کر دیا، اب آپ دہلی پہنچے ہی تھے کہ پہلے قدم پر آپ کی حق گوئی کا امتحان ہوا، جس سے آپ سرخرو ہو کر نکلے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ اللہ کے شیروں کو کبھی رو باہی آہی نہیں سکتی، ہوا یوں کہ جب آپ نے دہلی میں قدم رکھا تو سلطان نے بنفس نفیس کا استقبال کیا اور بڑے اعزاز و اکرام سے آپ کو شہر میں لایا اور قلعہ میں لے گیا، جو نہی آپ نے قلعہ کا دروازہ عبور کیا، دو ہاتھیوں کی موڑ میں دیکھیں، جن پر فیلبان سوار تھے، بادشاہ کو مخاطب کر کے فرمایا، میں قلعہ میں تلب داخل ہوں گا کہ یہ موڑیں توڑ دی جائیں، چنانچہ وہ ہاتھی اور فیلبان توڑ دیے گئے پھر آپ قلعہ میں داخل ہوئے، دوسرے روز آپ نے ارشاد فرمایا تمام گویوں کا توبل بے ریش رقاص لڑکوں اور تمام اہل بدعت کو منہ دوستان کے محروسہ سے نکال دیا جائے، بادشاہ نے اس ارشاد کی بھی تعمیل کی، ایک روز بادشاہ نے حضرت شیخ کو حیات بخش باغ کی سیر کرنے کی تکلیف دی، وہ سونے کی مچھلیاں تھیں جن کی آنکھوں میں جو اہرات ٹنکے ہوئے تھے، حضرت شیخ نے یہ دیکھ کر فرمایا، جب تک یہ مچھلیاں توڑ نہ دی جائیں میں اس جگہ نہ بیٹھوں گا، باغ کے محافظوں نے نقصان شاہی کے خیال سے ان کے توڑنے میں تامل کیا، لیکن بادشاہ نے فوراً ٹرپا دیا اور کہا کہ ارشاد شیخ کی تعمیل میں زیادہ نفع ہے..... بادشاہ اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیام سے بہت خوش ہوا، چنانچہ بادشاہ نے خواجہ محمد معصوم کی خدمت میں شکر گزاری کا عریضہ لکھا۔

یہ ہیں وہ حقائق جنہیں پیش نظر رکھ کر اپنے ذہن کو تصوف و ارباب تصوف

کے بارے میں پیدائشہ یا پیدا کر وہ غلط نامیوں سے صاف کیا جاسکتا ہے، اگر نیک  
 نیتی کے ساتھ دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ تصوف تعطل و جمود، عافیت کو شہی اور  
 سہل انگاری کا نام نہیں بلکہ تصوف ایک علمی، اخلاقی، روحانی اور معاشرتی تحریک  
 ہے جس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہے، تصوف نے جو ذہن اور اقدار تیار  
 کیے ہیں وہ بیک وقت عبادت گزار اور تقویٰ شعار بھی ہیں اور علم و اخلاق کے علمبردار  
 بھی، ان کے اندر علمی گہرائی بھی پائی جاتی ہے اور روحانی عظمت بھی، خدمت خلق ان  
 کا شیوہ ہے تو معاشرتی اصلاح ان کا وتیرہ، اگر وہ معیت و قرب خداوندی کی طلب  
 میں سرشار ہیں تو دوسری جانب ان کے دل خلق خدا کی محبت و ہمدردی سے لبریز  
 بھی ہیں، ایثار ان کا نصب العین ہے اور سروت ان کی متاع حیات، جہاں وہ  
 صدق و صفا کے پیکر ہیں وہاں وہ بذل و عطا کے مجھے بھی ہیں، دم گنت گوزم نظر  
 آتے ہیں مگر دم جستجو گرم بلکہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں، حلقہ یاراں میں ابرہیم اور رزم حق و  
 باطل میں مانند فولاد ہیں، ایک طرف وہ تبلیغی سرگرمیوں میں منہمک ہیں اور دوسری  
 جانب استیصال باطل کے لیے مصروف عمل، غرضیکہ ایک فرد بجائے خود انجمن  
 اپنی ذات میں تحریک اور انسانی پیکر میں ایک انقلاب ہے، رات کو ان کی آنکھیں  
 خشیت خداوندی سے اشکبار ہوتی ہیں اور دن کو ظالم و جابر کی آنکھوں سے ملائی  
 جاتی ہیں، نماز میں تضرع اور زاری سے جھکی گردنیں دربار میں اکرامی رہتی ہیں، شکستہ  
 مسجد کے خستہ حال موذن کی تکبیر پر دوڑ پڑنے والے، یہ فقیر بادشاہوں کے ہزار  
 بلا سے پر بھی اوصح کار رخ نہیں کرتے، خدا کے حضور کانپنے اور لرزنے والے یہ انسان  
 ایوان شاہی میں پہاڑوں کی سی مضبوطی کے ساتھ بات کرتے ہیں، مزدورین کی بیواؤں  
 ضعیفوں اور مسافروں کا بوجھ اٹھانے والے، وقت کے بادشاہوں کی اطاعت  
 کے حلقے کا بار گروں پر نہیں سہہ سکتے، یہ زندگان مولا صفات اور قدسی عادات،

یہ پاکباز و پاک نفس اپنی زندگی اس شان سے بسر کرتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی خدا کی بندگی شمار ہوتی ہے، کیونکہ ان کا ہر قدم رضائے خدا تعالیٰ کی طلب میں اٹھتا ہے، اور ان کے ہر عمل کا مقصد خدا کی خوشنودی ہے، ان کی نماز، ان کی قربانی ان کی زندگی اور ان کی موت سب ”رب العالمین“ کے لیے ہوتی ہے، حق و صداقت کے پیچھے جس راہ سے گزرے ان کے قدموں کی مٹی کا ہر ذرہ جاوہ پیمانوں کے لیے مشعل راہ اور منزل کے لیے سنگِ میل ہوتا گیا اور ان کے ذراتِ راہ دعوت و عزیمت کی تاریخ کا مستقل عنوان بنتے گئے جو قابلِ فخر بھی ہیں اور آنے والوں کے لیے قابلِ تقلید بھی۔

<http://t.me/Tehqiqat>



## ”فقر عبور“

جدید علم نفسیات میں عمل کے دو محرکات تسلیم کیے گئے ہیں ترغیب (TEMPTATION) اور ترمیب (PERSECUTION) اور عمل کے سلسلہ میں یہی دو مانعات بھی ہیں، یعنی اگر کسی کو کسی کام سے روکنا مقصود ہے تو دو ہی حربے استعمال کیے جاسکتے ہیں بیالایح دے کر خرید لیا جائے یا دھمکا کر خاموش کرادیا جائے، مگر جن لوگوں کے مذہب و مسلک کی بنیاد ”امانت داری“ اور اخلاص پر جو ان پر دونوں کا کچھ اثر نہیں پڑتا، ترغیب کی صورت میں وہ تاج سکندری پر طیر می نگاہ ڈالتا بھی پسند نہیں کرتے اور ترمیب کے ضمن میں ان کا عقیدہ یہ ہے :-

اے دل تمام نفع ہے سو دائے عشق میں  
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

ان کا ضمیر اور ان کی جان دونوں خدا کی امانت ہیں۔ بھاری سے بھاری قیمت کے عوض ضمیر بیچنا ان کے منشور زندگی میں نہیں کہ امانت ناقابل بیع و شرا ہوتی ہے جان کا خوف انہیں دامن کشش نہیں ہوتا کہ وہ ع  
جان دی ادی ہوئی اسی کی کھتی

کے مسلک کے علمبردار ہیں اس لیے ترغیب و ترمیب دو ایسے ہتھیار ہیں جو ان پر کبھی کارگر ثابت نہیں ہوئے۔

”آئین جو افرادِ حق گوئی و بیابالی“ کے عنوان کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ صوفیاء کرام نے نہ صرف خالقِ ہوں میں بیٹھ کر اصلاحِ اخلاق اور تزکیہ، نفس کی کوششیں کیں بلکہ ترمیم کے تمام تر فلسفے کے علی الرغم بادشاہوں، امیروں، تاجداروں اور کلاہ پوشوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، بادشاہوں کے ایوانوں، امرا کے درباروں تاجداروں کی تخت و تندی اور کلاہ پوشوں کی جاہ و شہمت کا صرف یہ ہی نہیں کہ صوفیاء نے اثر قبول نہیں کیا بلکہ اسے سراسر ناپاک کا کھیل سمجھا۔

ہر وہ تحریک جو رضا کارانہ بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو اس کی بنیاد میں اگر امانت و اخلاص موجود نہیں تو وہ کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی، دین کہ جس کا سارا دار و مدار قلب و روح کی آمادگی پر ہے اس کے لیے یہ دونوں شرطیں بہ طریقِ اولیٰ لازم ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی روحانی و اخلاقی فلاح کے لیے اور مسائلِ زندگی کی اصلاح کے لیے خداوندِ عالم کی جانب سے ایک لاکھ سے زیادہ نفوسِ قدسی الہامِ وحی سے سرفراز ہوئے اور منصبِ نبوت پر فائز ہو کر لوگوں کو بھولی ہوئی بات اور فراموش کردہ عہد یاد دلایا، لیکن اس کے طریقِ کار کے سلسلہ میں مختلف امتوں اور مختلف زمانوں کے انبیاء کے درمیان جو قدر مشترک ہمیشہ موجود رہی وہ یہی امانت و اخلاص کی قدر تھی اس وقت امانت کا ہمارے موضوع سے براہِ راست تعلق نہیں اس لیے اب دوسرا جزو ہم اپنے جائزے کے لیے مختص کرتے ہیں، ہر آنے والے بشر و مندر پر مبعوث ہونے والے نبی اور منصبِ رسالت پر فائز ہونے والی ذاتِ گرامی نے آتے ہی قوم کے سامنے اپنی بے غرضی، بے نفسی اور اخلاص کا یقین دلایا گویا وہ یہ جانتے تھے کہ جو پودا ہم لگانا چاہتے ہیں وہ بے غرضی اور اخلاص کے پانی کے بغیر کبھی نہیں اگ سکتا، اس لیے اس بات کا بار بار یقین دلایا اور لوگوں کے ذہنوں میں اسی بات کو راسخ کرنے کی برابر کوشش فرمائی، سورہ شعراء کی متعدد آیات ملاحظہ کیجئے۔

”قوم نوح نے بھی پیغمبروں کو مٹھلایا جب اُن سے اُن کے بھائی نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں تو خدا سے ڈرو، میرا کما مانو اور اس کام کا تم سے کچھ صلہ نہیں مانگتا میرا صلہ تو رب العالمین پر ہی ہے۔“

جناب ہود علیہ السلام نے فرمایا:-

”عاد نے بھی رسولوں کو مٹھلایا جب اُن سے اُن کے بھائی ہود نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تو خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور میں اس خدمت کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو جہانوں کے پروردگار کے پاس ہے۔“

جناب صالح علیہ السلام قوم سے مخاطب ہیں:-

”قوم ثمود نے رسولوں کو مٹھلایا جب اُن سے اُن کے بھائی صالح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں تو خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور اس خدمت کا معاوضہ تم سے نہیں چاہتا میرا معاوضہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔“

حضرت لوط علیہ السلام اپنی حیثیت اور رسالت کی عرض و غایت واضح کرتے ہوئے گویا ہیں:-

”قوم لوط نے رسولوں کی تکذیب کی جب اُن سے اُن کے بھائی لوط نے کہا تم تقویٰ کیوں نہیں اختیار کرتے میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں، تو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کما مانو اور میں تم سے اپنے اس کام کا کوئی صلہ نہیں مانگتا میرا اجر جہانوں کے پالنے والے کے پاس ہے۔“

حضرت شعیب علیہ السلام بھی دوسرے انبیاء کرام سے ہم آہنگ اور اُن

کے ہمنوا ہیں اور فرماتے ہیں :-

”میں تم سے اس کام کا کوئی بدلہ نہیں چاہتا، میرا جز تو جہانوں کے پالنے والے پر ہے۔“

قرآن مجید میں ایک ایسا فرستادہ کا ذکر ملتا ہے جو شہر کے کنارے سے آیا تھا، اس نے جو بات جس در و اور سوز میں ڈوب کر کہی اور جس غلام اور اپنائیت سے کہی، ایک طرف وہ اس کے جذبہ اطاعتِ حق کی غماز تھی اور دوسری جانب مقام رسالت و منصبِ نبوت کو واضح کرنے کے لیے دلیل قاطع اور برہان ساطع تھی اس نے کہا :-

”اے قوم رسولوں کی اتباع کرو، ان کی اتباع کرو جو تم سے کوئی معاوضہ

نہیں چاہتے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔“

اس نے بیک وقت دو باتیں کہیں کہ رسول کی صداقت کی دو ہی دلیلیں ہو سکتی ہیں، اس کے قول و فعل میں ہم آہنگی اور صلہ سے بے نیازی اور یہ دونوں چیزیں انبیاء کرام کی سیرتوں کا طرہ امتیاز ہیں، اس نے اپنے کلام میں یہ کہہ کر زور پیدا کر دیا کہ اتباع تو کرنی بھی اس کی چاہیے جو داد و ستد سے بے پروا، حصولِ منفعت اور جلبِ زر سے گریزاں اور لالچ اور غرض سے پاک ہو۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس عقیدے کا اظہار بار بار فرمایا :-

”آپ کہہ دیجئے میں تم سے اس خدمت کے لیے کسی معاوضے کا طلبگار نہیں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار اپنے خطبوں میں لوگوں پر یہ امر واضح کیا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں کسی صلہ کی تمنا، مزد و معاوضے کی خواہش اور داد و دہش کی آرزو کے بغیر کر رہا ہوں، بلکہ آپ نے زندگی بھر اس امر کا اہتمام کیا کہ کسی سے کوئی چیز اس طرح نہ لی جائے چاہے وہ عاریتہ ہو یا قرضِ حسنہ کے طور پر، جس میں اجر و معاوضہ

کا کوئی شائبہ تک موجود ہو۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نفسی اور بے غرضی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اولاً آپ نے کوئی میراث نہیں چھوڑی، ثانیاً اگر کوئی اہل قلیل چھوڑی بھی ہے تو کسی کو اپنا وارث نہیں بھڑایا اور ثالثاً تمام صدقات واجبہ کو اپنی اولاد پر حرام قرار دے دیا، ادنیٰ اسے ادنیٰ شائبہ بھی اگر پیدا ہونے کا امکان تھا تو اس کی راہ بھی مسدود کر دی بخاری کی ایک روایت ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے عالم میں وفات پائی کہ آپ کی زرہ تیس صاع جو کے بدلے ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔ یہودی سے قرض لینے کی سہولتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے شارحین حدیث اور علماء نے مختلف آراء پیش کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ :-

آپ اس کے شبہ اور شائبہ سے بھی بچنا چاہتے تھے کہ آپ کے ذریعہ اہل ایمان کو دین کی جو دولت ملی، اس کے عوض آپ کوئی حقیر سے حقیر بھی دنیوی فائدہ ان سے اٹھائیں اس لیے ضرورت کے موقع پر آپ قرض بھی غیر مسلموں سے لینا چاہتے تھے۔

اسی اخلاص و امانت کو تصوف کے حلقوں میں فقر غنیور کہا جاتا ہے جو ہمارا عنوان بحث ہے، صوفیاء کرام نے جن کھٹن حالات، ناسازگار ماحول اور مخالفت فضا میں تبلیغ و اشاعت کا مشکل ترین اور صبر آزما فریضہ سرانجام دیا اس کا جائزہ ایک مستقل عنوان کے تحت لیا گیا ہے، لیکن اس سب کے باوجود صوفیاء کا دامن لالچ اور حرص سے پاک ہے، قدموں میں عمدے ڈالے گئے، ہاتھوں میں جاگیروں کے قبائے دیے گئے، مراعات و وظائف کے پروانے پیش کیے گئے، آزمائش و امتحان

کے طور پر زرد جو اہر ڈھیر کیے گئے شاید آنکھیں ان کی چکا چوند سے خیرہ ہو جائیں قبول منصب کی صورت میں حاصل ہونے والے فوائد اور انکار کے نتیجے میں پیش آنی والے مصائب و شدائد گنوائے گئے، بیک وقت دو متضاد کیفیتوں سے دوچار کر کے انعام و اکرام قبول کرانے کی کوششیں کی گئیں، قہری عزیزیوں اور عزیز دوستوں کو درمیان میں لاکر "تقسیم زر" میں ان "طائرانِ لاہوتی" کو بند کرنے کے جتن کیے گئے، مگر ان کی روح کی آزادی، دل کے غنا و امیر فقر کی غیرت انہیں کسی چیز کی طرف آمادہ و مائل نہ کر سکی انہوں نے پھونس کے جھونپڑے کو ایوانِ شاہی، ٹاٹ کی ٹوپی کو کلاہِ خسروی، کھدکی پوتین کو قبائے سلطانی، جو کے ان چھنے آٹے کی روٹی کو مرغ و ماہی کی قابلوں، فرشِ خاک کو سجاد و سمور کے بستروں اور بوریہ نشینی کو صدر نشینی کے عرصے نہ بیچ کر غیرتِ فقر کی لاج رکھی اور یہی ان کی کل کائنات تھی، صوفیاء کرام کو ہمیشہ یہ منقرد اعزاز حاصل رہا ہے کہ انہوں نے دنیا کو پاؤں کی ٹھوکر اور بندگانِ دنیا کو بوتے کی نوک پر رکھا ان کا مٹی کا لوٹا بوسیدہ چاٹی، ٹوٹی تیسر اور پھٹی ٹوپی شاہوں کے تخت و تاج سے زیادہ قیمتی تھی، جنہیں فرشِ خاک پر اور فقیروں کے درمیان بیٹھنے کا لطف میسر آیا، انہیں مسندِ امارت پر اور خدام و حشم کے جلو میں بیٹھنا کیسے راس آسکتا تھا، اس لیے جب سلطان بجنور نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو نیم روز کی گورزی پیش کی تو آپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

صوفیاء کرام جہاں بھی گئے فقر و استغناء کی مثالیں قائم کر آئے، جو خدمت سرانجام دی بلا مزد و معاوضہ سرانجام دی، تبلیغ کو پیشہ نہیں بلکہ فریضہ سمجھ کر ادا کیا، لوگوں کو ایمان و ایقان کی لازوال دولت سے نوازنے کے باوجود ان کی دولت میں خود کو کبھی حصہ دار نہ جانا، بادشاہ ان کے جھونپڑوں کا طواف کرتے رہے مگر انہوں نے کبھی شاہ کے در دولت پر دستک دے کر غیرتِ فقر کو مروج نہیں کیا یہی وجہ

ہے کہ دنیا پرست علماء و جوہاد شاہوں کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھٹکتے تھے اور ان کے اشارہ ابرو پر ضمیر و ایمان کے سودے چکاتے تھے، باوجود منصب سبب اور سرکاری تحفظ و مراعات کے لوگوں کے دلوں میں وہ مقام پیدا نہ کر سکے جو ان بے نواؤں کو حاصل ہے اور آج تجربہ شاہد ہے کہ لوگ فوراً اس سے بدظن ہوتے ہیں جو امراء کے ارد گرد منڈلاتا ہو اور وہ شخص دنیا کے دل کے تخت پر ٹھکانا ہے ہے جس نے اپنا پیوند کسی کے پاس گرومی نہ رکھا ہو۔

بادشاہوں نے اپنی سی کوشش کر ڈالی، امراء کی التجاؤں سے لگھی بندھ گئی سرمایہ دار خاک چاٹتے رہے، جاگیر دار پیشانیاں رگڑتے رہے، نواب در پر پڑے رہے، رئیس کہہ کہہ کر عاجز آگئے، ہمارا جوں کے تو خشک ہو گئے، کسی نے نذر دینی چاہی کسی نے ہدیہ پیش کرنا چاہا، کسی نے جاگیر بخشی چاہی، کسی نے منصب سونپنا چاہا، کسی نے وظیفہ جاری کرنا چاہا، مگر کسی ایک کی بھی پیش نہ گئی اور یوں صوفیاء کرام نے غیرتِ فقر کے فالوس کو بچنے نہ دیا،

شیخ نور ترک اعلیٰ پایہ کے بزرگ گزرے میں، بابا فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ نظام الدین اولیا، خواجہ میر خورز، اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے آپ کا ذکر بڑے احرام اور شاندار الفاظ میں کیا ہے، آپ رضیہ سلطانہ (عہد حکومت ۹۳۴ تا ۹۳۷) کے عہد میں ہو گئے ہیں، بڑی بے نیاز اور غیور طبیعت پائی تھی، کسی سے طمع اور کسی سے تمنا آپ کی سرشت میں نہ تھی، نہ دولت کے لیے ہاتھ پھیلائے اور نہ آنکھ اٹھا کر دیکھا، خواجہ نظام الدین اولیا دہلویؒ نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: ایک بار رضیہ سلطانہ نے زر نقد بھیجا، یہ اچھی خلصی رقم تھی، آپ نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت ایک چھری تھی انہوں نے اس چھری کو زر نقد پر مارا اور فرمایا یہ کیا ہے؟ اسے میرے سامنے سے لے جاؤ۔

اسی رضیہ سلطانہ کے والد سلطان شمس الدین التمش کے دور کا واقعہ ہے یہ بادشاہ ایک فقیر فش، نیکو کار اور تقویٰ شعار بادشاہ تھا، بزرگوں سے بے حد عقیدت و محبت رکھنے اور ان سے خندہ پیشانی سے پیش آنے والا تھا، ذاتی طور پر بے حد شریف اور متقی انسان تھا، خواجہ قطب الدین بختیار کالی سمیت معاصر بزرگوں اور صوفیوں سے اس کے نیاز مندانہ اور عقیدت کیشیا نہ تعلقات تھے، لیکن تاریخ شاید ہے کہ کسی صوفی اور بزرگ کے لیے شاہ کی دوستی کبھی مسئلہ نہ بنی، ملنے بلانے کی حد تک بزرگوں نے اخلاص مگر لینے لوانے کے معاملہ میں استغناء کا ثبوت پیش کیا، حالانکہ سلطان نے جو کچھ پیش کیا، لالچ کے طور پر نہیں ازراہ عقیدت پیش کیا مگر "فخرینور" اسے بھی برداشت نہ کر سکا۔ شیخ حامد بن فضل اللہ جمالی رقمطراز ہیں :-

"ایک بار سلطان شمس الدین التمش نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کالی کو دہلی کی "شیخ الاسلامی" کا منصب پیش کیا تو آپ نے اس پیشکش کی جانب مطلق توجہ نہ کی۔"

اس دور میں شیخ الاسلامی کا منصب مذہبی اور سیاسی نقطہ نظر سے کوئی معمولی منصب نہ تھا، تفصیل کا موقع نہیں دینا بتایا جاتا کہ اس منصب کے لیے کتنے تعبادار اور عمامہ پوش "بے چین اور سرگردان تھے اور جس کے دل کے کسی بھی گوشے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا جائے تو کہیں ذرا سی بے چینی نظر نہیں آتی، عہدہ اسے دیا جا رہا ہے مگر اسے "شیخ الاسلام" سے نہیں "اسلام" سے غرض تھی، اس کی تو خواہش تھی کہ زندگی اگر "خادم اسلام" کی حیثیت سے گزار جاؤں تو زہے نصیب، شیخ الاسلام ہونا تو بڑی بھاری ذمہ داری ہے، اسے محض "نمبر داری" نہیں بلکہ "ذمہ داری" کا احساس تھا۔

عام لوگ جب صاحب منصب و جاہ بن جاتے ہیں تو ان کی گردنیں فخر سے تن جاتی ہیں، کسی کو جاگیر مل جائے تو اس کا قدم زمین پر نہیں پڑتا، کسی کو زمین کا قطعہ حاصل



ہو جائے تو اس کے سر میں عجب غرور آجاتا ہے، مگر فقیر غیور جن کا سرمایہ حیات ہو وہ ان چیزوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؛ ملاحظہ فرمائیے، خواجہ حسن دہلوی، خواجہ نظام الدین اولیاء کی ایک مجلس منعقدہ ۱۹ جمادی الاول ۱۳۱۲ھ کی رویداد قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”سعادت قدم بوسی میتر آئی، انہی دنوں کسی رئیس نے دو باغیوں کے اور اسباب و آلات سمیت بہت سی زمین کی ملکیت کے کاغذات آپ کی خدمت میں بھجوائے تھے اور آپ کے ساتھ اپنے اخلاص کا اظہار کیا تھا، حضرت خواجہ نے قبول نہ کیا، حضرت اس باب میں فرما رہے تھے کیا میں باغ، کھیتی اور زمین والا چوہدری بن جاؤں، آپ تبسم فرما رہے تھے اور کہہ رہے تھے میں یہ قبول کر لوں تو لوگ کیا کہیں گے، یہی کہ شیخ باغ کو جا رہا ہے، شیخ کھیتوں اور اراضی کے معائنہ کے لیے جا رہا ہے، یہ میرا عجیب و غریب فعل ہوگا، اس کا کوئی عمل ہے؛ یہ کہتے کہتے آپ ابدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے، ہمارے خواجگان اور ہمارے مشائخ میں سے کسی نے بھی اس طرح کا کام نہیں کیا۔“

کسی نے سچ کہا ہے :-

۵۔ جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں آدمی بے نظیر ہوتے ہیں  
ہم چند سطور قبل خواجہ بختیار کاکیؒ کے ضمن میں لکھ آئے ہیں کہ انہوں نے شیخ الاسلامؒ کے منصب کو لائق اعتناء نہ سمجھا، شیخ کاکیؒ کے مرید و خلیفہ بابا فرید الدین گنج شکر ہیں اور ان کے مرید و خلیفہ خواجہ نظام الدین دہلویؒ ہیں شیخ الشیوخ کی سیرت کا پرتو خواجہ نظام الدین دہلویؒ کے آئینہ میں دیکھئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے جو خواجہ نظام الدین دہلوی کے عقیدتمندوں اور ارادت کیشوں میں سے تھا، آپ سے ”شاہی امامت“ قبول کرنے

کی درخواست کی تو فرمایا: ہمارے پاس سوائے نماز کے اور کیا ہے؟ بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی جاتی رہے۔

غنا مال و اسباب سے حاصل نہیں ہوتا، اس کا مقام دل ہے، غنا کا تعلق حکم سیری سے نہیں چشم سیری سے ہے، جس کی آنکھ سیر اور دل غنی نہیں اس کا پیٹ صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے لیکن جسے "مقام غنا" حاصل ہے وہ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود مٹھی میں دونوں جہان کے خزانے رکھتا ہے، غنا کمیت کا نام نہیں، کیفیت کا نام ہے، اس کیفیت کے پیدا کرنے میں روح اور قلب کی آزادی کا خاصہ حصہ ہوتا ہے، دل کی آزادی ہی تو شہنشاہی ہوتی ہے، جو چیز مردانِ احرار کو حاصل ہے وہ "شاہانِ تاجدار" کے نصیبوں میں کہاں؟ چٹائی پر بیٹھ کر سردہ نشینی کا لطف مردانِ احرار کی قسمت میں ہوتا ہے، ایسے ہی راہ نشین اور غنی دل رکھنے والے فقیر کا ایک واقعہ ہے جسے میر خور و نے سیر الاولیاء میں نقل کیا ہے اور ہم اسے "تاریخ مشائخِ چشت کے حوالے سے لکھ رہے ہیں۔"

"ایک بار والی ناگور نے شیخ حمید الدین ناگوری کو شاہ وقت کی جانب سے کچھ زمین اور نقد روپیہ پیش کیا اور قبول کرنے کی درخواست کی، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "ہمارے خواجگان میں سے کسی نے ایسی چیز قبول نہیں کی، ایک بیکہ زمین جو میر سے پاس ہے، میر نے لیے کافی ہے۔"

اوزنگدیب عالمگیر کا ایک بیٹا صوفیاء اور اولیاء سے عقیدت رکھنے والا تھا اور اسے برابر کسی بزرگ اور صوفی کی تلاش رہی تاکہ زیارت سے فیض یاب ہو سکے، عالمگیر کو اس کی ان سرگرمیوں کا پورا علم تھا چنانچہ اس نے ایک مفصل خط میں بیٹے کو لکھا کہ ہر ماہ اس قابل نہیں کہ اسے پکڑ لیا جائے اور ہر امن اس لائق نہیں کہ اسے تھام لیا جائے

بڑے بڑے و عویدار اکثر و بیشتر بہت چھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا اس معاملہ میں احتیاط و حرم اختیار کرو اور آخر میں ایک ایسے بزرگ کا واقعہ لکھا جو فقر و استغناء کا پیکر تھا جس کا اثر شہنشاہ نے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا، اور بزرگ زینب لکھتا ہے:-  
 میں نے ایک بار شیخ عبداللطیف بریلوی کو گاؤں قبول کرنے کی درخواست کی تو فرمایا:-

شاہ مارا وہ وہد منت نند      رازق مارزق بے منت وہد  
 بادشاہ ہمیں گاؤں دیتا ہے اور احسان دھرتا ہے، ہمارا رازق ہمیں بغیر  
 منت جتائے رزق دیتا ہے۔

شیخ نے بڑی لطافت اور خوبی سے اپنی بے نیازی کا اظہار بھی کر دیا اور مصنوعی اور حقیقی خداؤں میں فرق بھی واضح کر دیا، دل کی بات زبان پر لانے اور حسن تدبیر سے بات سمجھانے کا ڈھنگ کوئی ان سے سیکھے۔

حضرت مرزا جانجاناں کے بارے میں آگے سے کہ ایک امیر نے ایک حویلی اور خانقاہ تیار کر کے اور فقراء کی وجہ معاش مقرر کر کے آپ کی خدمت میں عرض کیا اور قبولیت کی درخواست پیش کی آپ نے ان مراعات کو قبول نہ فرمایا اور جواب دیا:-  
 چھوڑ جانے کے لیے اپنا اور بیگانہ مکان برابر ہیں، فقیروں کا خزانہ  
 صبر و قناعت ہے۔

انہی کے متعلق ایک اور ایمان افروز اور حقیقت کشا واقعہ ہے کہ ایک دن سخت جاڑے میں آپ ایک پرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے، نواب خان فیروز جنگ دربار میں حاضر تھا یہ حال دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس نے اپنے ایک معاحب سے کہا کہ ہم گنہگاروں کی کیسی بد قسمتی ہے کہ وہ بزرگ جن کی خدمت میں ہمیں ارادت ہے ہماری نیاز قبول نہیں کرتے، آپ نے فرمایا:-

فقیر نے روزہ رکھا ہوا ہے کہ امیروں کی نیاز قبول نہ کروں گا اب جبکہ  
آفتاب مغرب ہونے کے قریب پہنچ گیا ہے، میں اپنا روزہ  
کیوں توڑوں۔“

آپ کی سیر و سوانح پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ واقعی آپ نے کبھی اپنا روزہ نہیں  
توڑا اور زندگی بھر اپنے عہد پر قائم رہے۔

مرزا جاناماں کے عقیدتمندوں میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اچھے خاصے رئیس  
اور متمول آدمی تھے، مگر ان کی ہر مالی پیش کش آپ کی غیرتِ فقر کی نذر ہو گئی، آپ کی  
اس ظاہری تنگدستی کو دیکھ کر ایک بار نواب نظام الملک نے بھی کچھ پیش کرنے کی جرات  
کی تھی مگر اس کی درخواست کو درخود اعتنا نہ سمجھا گیا، آپ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ:-

”ایک بار نواب نظام الملک نے تیس ہزار روپیہ بطور نیاز پیش کیا آپ نے

حسبِ عادت قبول نہ فرمایا تو نواب نے عرض کیا آپ انہیں لے کر راہ

خدا میں فقیروں کو بانٹ دیں، آپ جلال میں آگئے فرمایا میں تمہارا خاناں

ہوں؛ یہاں سے تقسیم کرنا شروع کرو وگھر پہنچے تک ختم ہو جائیں گے۔“

اہلِ زرچینٹی کی مانند اپنا رزق زمین میں تلاش کرتے ہیں اور یوں رینگنے والے فقیر

کیڑے بن کر رہ جاتے ہیں مگر اہلِ فقر عقاب کی مانند فوسپر کو نگاہ میں نہیں لاتے بلکہ

ان کی نگاہ تو فضاؤں سے بھی ورے ہوتی ہے، وہ خود کو اللہ کا عیال سمجھ کر رزق کا

ذمہ اللہ کو سونپ دیتے ہیں جب وہ رزق میں اس خدا کو اپنا کفیل بنا لیتے ہیں جو کبھی

نہ ہاتھ سکڑاتا ہے نہ اس کا خزانہ خالی ہوتا ہے اور نہ ہی کبھی بھولتا ہے تو پھر ان کی نظر

میں شاہوں اور راجاؤں اور رئیسوں کی حیثیت ملو مور سے زیادہ نہیں رہتی نہ تو رزق

برقِ لباس ان کی آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں، زریں طشت ان کا دل بہلاتے ہیں اور نہ

کھینکتے سکے ان کے دل کی دھڑکن تیز کرتے ہیں، بلکہ ان کی بے نیازی میں ایک اور

شان پیدا ہو جاتی ہے۔ شاہ توکل انبالویؒ کے بارے میں پروفیسر نور بخش توکلی لکھتے ہیں :-

”ایک بار مہاراجہ جتوں نے طشت میں نذر رکھ کر پیش کی، فرمایا یہ کیا ہے عرض کیا پالتو بیکہ زمین کے کاغذاتِ ملکیت، ایک نوٹ اور کچھ اشرافیاں میں فرمایا میں زمین سے کر کیا کروں گا یہ تو فساد کی جڑ ہے، ان روپوں کی بھی مجھے ضرورت نہیں اور پھر آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا ”ویکھ وہ ہمدانگر ہے، وہاں سے روپیہ پیسہ اور اناج چلا آ رہا ہے“۔“

حضرت شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ اس دور کے باخدا اور نہایت ہی روحانی بزرگ گذرے ہیں، آپ کا حلقہ ارادت دور دور تک پھیلا ہوا تھا، باوجود اس کے کہ آپ متاخرین میں سے ہیں مگر جو اخلاص، اورو، سوز، فقر، تقویٰ، پارسائی اور استغناء آپ کے ہاں ملتا ہے اس سے آپ متقدمین میں ایک نمایاں فرد نظر آتے ہیں، مادہ پرستی کے اس دور میں یہ روحانی وجود عطیۃ الہی سے کم نہیں، آپ بیک وقت سریرِ آرائے علم و فضل اور زربِ سجادہ تقویٰ و ولایت تھے، آپ کی سوانح میں بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں جو آپ کے فقرِ غنیورہ کی نشاندہی کرتے ہیں، آپ کے ہاں آنے والوں میں عامی و عالم، رعایا و حاکم اور چھوٹے بڑے ہر طبقہ زندگی کے لوگ شامل تھے بلکہ آپ کے ارادتمند مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور انگریز بھی تھے اور وقتاً فوقتاً حاضری دیا کرتے تھے، یورپی اور ادوہ کے انگریز لیفٹیننٹ گورنر نے متعدد بار آپ کی زیارت کی، اس سب کے باوجود ہی سامان گدایانہ اور اندازِ شایانہ برقرار رہا آپ کے سوانح نگار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :-

”ایک مرتبہ الہ آباد سے ہائی کورٹ کا ایک انگریز جج اس تحقیق کے لیے آیا تھا کہ آپ کے پاس ہر ملک کے لوگوں کا مجمع کیوں رہتا ہے؟“

کیونکہ اس زمانہ میں حیدرآباد سے نواب خورشید جاہ آپ کے پاس آئے تھے، آپ نے فرمایا توبہ کے لیے آتے ہیں، ہم ان کے گواہ ہو جاتے ہیں تم بھی شرک سے توبہ کرو ہم گواہ ہو جائیں گے۔ انگریز اس صاف گوئی پر بڑا خوش ہوا اور کہا آپ کی خانقاہ کے لیے اگر فرمائیں تو ملکہ معظمہ کو لکھوں، فرمایا کیا ضرورت ہے، ہمارے پاس خدا کے فضل سے دو جوڑے کپڑے، دو لوٹے مٹی کے اور دو گھڑے موجود ہیں۔

صوفیاء کرام کا کہنا ہے کہ کوئی شخص اس وقت فقیر نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی نظر میں سونے کی ٹولی اور مٹی کا ڈھیلہ برابر نہ ہو جائے، بعینہ یہی بات ہیں صوفیاء کے کردار میں نظر آتی ہے کہ چمکتے کھنکے سکے ان کی نظر میں ٹھیکریوں اور گھونگولوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے، مال و دولت کا ذکر سن کر صوفیاء کبھی پہلو بدلتے پر عبور نہیں جئے جس سے ان کی بے تابی کا احساس ہو، اپنی شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی کے بارے میں مذکور ہے، مولانا محب اللہ مدوہی فرماتے ہیں :-

ہم نے شاہ فضل رحمن کی خدمت میں عرض کیا، کبھی رامپور تشریف لے چلے نواب کلب علی خان (والی رامپور) آپ کے دیدار کے بڑے مشتاق ہیں آپ کے تشریف لے جانے کی صورت میں ایک لاکھ روپیہ نذر کریں گے، آپ جس طرح سے بات کر رہے تھے اسی طرح کرتے رہے اور اس پیش کش کو معمولی بات کی طرح ٹال دیا، اور فرمایا کہ میاں لاکھ روپے پر خاک ڈالو اور بات سنو،

جو ہم دل پہ اسکا کرم دیکھتے ہیں تو دل کو بہ ازجام جم دیکھتے ہیں اور پھر وہی سوز و عشق کی کہانی کرتے رہے۔

سچ ہے خدا کے در پر دامن پھیلائے دو عالم سے بے نیاز ہو جاتے ہیں

اور اس کی گلی میں بستر لگانے والے پھیری لگانے سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔  
 حضرت شاہ غلام علی عزالمتوئی (۱۲۴۰ھ) بھی اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے  
 ایک خدا رسیدہ بزرگ ہیں جو زمانے میں فقرِ غنیور کے والے سے متعارف ہیں  
 جس طرح شعلہ و شبنم کی یکجائی بخوبی روزگار ہے اسی طرح میر و فقیر کی ہم آغوشی بھی  
 باعث ہزار تعجب ہے اسی لیے فقر و زر کی آپس میں کبھی نہیں بنی بلکہ گھٹی رہی ہے  
 امارت نے بار بار سرے جا لے، مگر فقر کا ترغ و حشی بہت کم ہی زیر و ام آیا اگر  
 ایسا ہوا ہے تو وہ فقر میں ابھی پر مارستہ ہوگا ورنہ طائر لاہوتی اور اڑنے کے آئے  
 ایک دانے کے لیے، یہ قطعاً ممکن نہیں، حضرت شاہ غلام علیؒ بھی ایسے ہزار و ام سے  
 ایک جنبش میں نکل آئے تھے، اور یوں فقرِ غنیور کی تاریخ میں ایک سرے باب کا  
 اضافہ کر دیا، سر سید احمد خانؒ کہتے ہیں:-

ایک دفعہ نواب امیر الدولہ امیر محمد خان والی ٹونک نے بہت التجا سے  
 درخواست کی کہ یہ وطنے کا فقر منظور فرمایا جائے اس کے جواب میں  
 آپ نے صرف یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:-

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم با میر خان بگومی کہ روزی مقرر است

ان الفاظ پر اس موضوع کو ختم کیا جاتا ہے اور ایک بار پھر ہم اس بات کا اعادہ  
 کریں گے کہ ذرا توجہ اور گہرائی سے جاننے کی کوشش کیجئے کہ تصوف کیا ہے، ارباب  
 تصوف کیا تھے؟ ان کی سیرتیں اور شخصیتیں کس پائے کی تھیں، جب ساحل سے کبھی اندازہ  
 طوفان نہیں ہو سکتا، جب شناساوری کے بغیر کبھی موتی ہاتھ نہیں آسکتا، تو یہ نا انصافی  
 صرف تصوف سے کیوں برتی جاتی ہے؟

# تاج شہی فقر کے قدموں پر

ہم "فقرِ غنیور" کے عنوان میں وضاحت سے لکھ آئے ہیں کہ صوفیاء کرام کی عظمت و جلالت کا راز ان کے فقرِ غنیور میں پوشیدہ تھا، جب فقرِ آدابِ خود آگاہی کا معلم بنتا ہے تو انسان کو اپنی منزلِ آسمانوں سے بھی پرے نظر آتی ہے، فقرِ بجائے خود فخر ہے فقر کے حسین چہرے کو مزید کسی غازے کی ضرورت نہیں ہوتی، فقر کے رستے دلداریم کو مشاطہِ نظرتِ خود سوار تہی نکھارتی ہے۔

تاریخِ تصوف کا جہاں ہر باب بعیرتِ افروز ہے وہاں دلچسپ بھی ہے ایسی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں کہ عقل و ربطِ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتی ہے، یہ تو بار بار ہوا کہ قصرِ مَرَمَر سے نگاہیں کٹیا کی طرف اٹھیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ جھونپڑی کی درز سے کبھی نظروں نے فلک بوس مفلوں کا طواف کیا ہو، یہ نظارہ تو ہزاروں لوگوں نے دیکھا کہ مریں محل سے اکتا کر شاہانِ وقت گھانس بھونس کی جھونپڑی میں اگر عافیت کے طالب ہوئے مگر اس کا ایک بھی گواہ نہیں کہ بوریا نشین نے شاہوں کی چوکھٹ پر سر نیاز جھکایا ہو، وارثان کے وجہ تو تاج و تخت سے اکتا گئے مگر بوڑھو مسلمان کے مسند کشین کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے، تاریخ نے شاہوں کو آتے دیکھا لیکن گداؤں کو جاتے نہیں دیکھا امیروں کو کھدر کے چھترے راس آگئے، لیکن فقیروں کو حسریہ و پزیریاں، کانٹوں کا اورٹھاوا لگے۔



تاج زر اور خرقہ فقر کی داستان بڑی ہی عجیب و غریب ہے، تخت کے موتی اور میرے وہ کچھ ندے سکے جو بیابان کے ذروں نے دیا، کلاہ خسروی اس قدر باغ کو اونچا نہ کر سکی جتنا کہ دوتی کی ٹوپی نے کر دیا، سکندر گھڑی گھڑی بھلتے رہے مگر قلندر جہاں تھے وہیں رہے کیوں کہ یہی انسانیت کی معراج کبریٰ ہے، سکندر کو تخت و تاج سیر چشتی ندے سکے مگر قلندر کو فقر نے تو نگر بنا دیا، اب آئیے تاریخ کے دامن پر بکھرے موتی چھینے، نید اشرف جہانگیر، شیراز کے حاکم اعلیٰ، ۸۰۸ھ میں وفات پائی، آپ کے بارہ میں آتا ہے۔

آپ نے اپنی والدہ کی اجازت سے سمنان (شیراز) کے تخت سلطنت کو چھوڑ کر فقر و صوفی اختیار کیا۔

حاکم شاہ، کچھ کرمان کے گورنر تھے، ۱۳۶۸ھ میں وفات پائی، آپ کی کایا کلب کا حال ملاحظہ ہو، ڈاکٹر شیخ اکرام لکھتے ہیں۔  
 "شاہ رکن عالم طمانی کے سر پر بیٹے، گورنری چھوڑ کر ارشاد و ہدایت اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گئے، اوج اور سکھر کا درمیانی علاقہ آپ کا مرکز بنا۔"

وقت کے صاحبِ جلالت، ہمیت بادشاہ فقیروں سے ملنے کا شوق دل میں پیدا کیے رہے مگر اللہ والوں کے دل میں کبھی شاہ کی ملاقات نے چٹکی نہیں لی، ان کے نزدیک لوگوں کے دین کے لیے دنیا اور دنیا داروں کا قرب بکریوں کے لیے بھڑیے کی نسبت زیادہ نقصان دہ تھا، بادشاہ کے کہنے پر نے فقیر کے دل کو نہیں بھایا لیکن اربابِ تخت و تاج ان کے ہاں حاضری کو دنیا و آخرت کی سعادت سمجھتے رہے،

حضرت شیخ برہان الدین مرغینانی صاحب الہدایہ کے شاگرد، شیخ برہان الدین

ملی کے بارہ میں شیخ مرغینانی کی پیشین گوئی تھی،

یہ بچہ اس قدر عظیم و علیل ہوگا کہ بادشاہ اس کے دروازے پر حاضری کو

سعادت سمجھیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا، سلطان غیاث الدین بلبن ہمیشہ

جمعہ کی نماز کے بعد شیخ برہان الدین ملی کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، لہٰذا

حضرت شیخ قطب الدین کاشانی جہاں ایک طرف مرجع عوام تھے وہاں وہ مرجع

خواص بھی تھے، حلقہ ارادت میں ممتاز مشائخ سے لے کر حلیل القدر بادشاہ تک شامل

تھے، ہزاروں لاکھوں لوگوں کے مرشد و رہنما خواجہ بہار الدین ذکر یا بھی ان میں سے تھے

جن کے دل شیخ کاشانی کی عقیدت اور محبت سے لبریز تھے، یہی وجہ ہے کہ شیخ

کاشانی ایک دوسرے کے موقع پر جب تک ملتان ٹھہرے رہے، خواجہ بہار الدین

زکریا روزانہ صبح کی نماز ان کے پیچھے جا کر بیٹھتے اور نیاز حاصل کرتے، شیخ کاشانی

جب ملتان کے راستے دہلی تشریف لے گئے تو سلطان شمس الدین التمش شہنشاہ

ہند نے بنفس نفیس باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا اور دعائیں حاصل کیں۔

انہی سلطان شمس الدین کا بیٹا شہزادہ ناصر الدین بھی اپنے والد کی طرح الشہداء

کا عقیدت مند تھا جب وہ ملتان اور اوج کے دورہ پر گیا تو اوج دھن (پاک پٹن) میں شیخ

فرید الدین گنج شکر کی قدمبوسی کی۔

سلطان شمس الدین التمش، باوجود شہنشاہ ہونے کے خود بھی متقی اور مشرع

انسان تھا اگر وہ خلعت شاہی کے بجائے صوف کا خرقہ اور کلاہ خسروی کی جگہ کلاہ نقر

اوپر لیتا تو وقت کا صوفی اور شیخ ہوتا تاہم اس کے صانع، پرہیزگار اور متدین ہونے پر ایک

زمانہ متفق ہے، سلطان کو سچے دیگر بزرگوں کے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی تخلص

اول خواجہ معین الدین حسن حشتی سے خصوصی عقیدت تھی، دار الحکومت دہلی میں جب

شیخ ملتان سے آئے تو سلطان نے خدا کا شکر ادا کیا اور شہر سے باہر نکل کر آپ کا

خیر مقدم کیا خواجہ حامد بن فضل اللہ جمالی شیخ اور سلطان کے باہمی روابط اور سلطان کی مخلصانہ عقیدت کے متعلق تحریر کرتے ہیں :-

”سلطان ہفتے میں دو بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ سے فیض حاصل کرتا۔ چونکہ آپ کی قیام گاہ شہر سے باہر اور ذرا فاصلے پر تھی، سلطان نے عاجزی سے درخواست کی کہ اگر براہ کرم دعائیت آپ شہر کے نزدیک قیام پذیر ہوں تو بہت بہتر اور نہایت خوب ہو آپ نے سلطان کی درخواست منظور کر لی۔“

آپ ان واقعات سے اندازہ فرماتے جیسے، شانِ فقر اور عظمتِ فقر کا اور سماجِ شہی فقر کے قدموں پر کی جھلکیاں ملاحظہ کرتے جیسے۔

شیخ رکن الدین ابوالفتح جنہیں دو بادشاہوں کا زمانہ ملا۔ بایں ہمہ فقیر لے کبھی شاہوں کی جانب التفات نہ کیا مگر شاہ ”بابِ فقیر“ سے مستغنی نہ رہ سکے، وہ خوب جانتے تھے کہ نعم الامیر علی باب الفقیر — میں دونوں کی عزت ہے، صاحب سیر العارفين شیخ ابوالفتح کی دہلی آمد کے بارے میں لکھتے ہیں :-

”شیخ دو مرتبہ سلطان علاؤ الدین اور تین بار سلطان قطب الدین کے زمانے میں دہلی تشریف لائے سلطان علاؤ الدین باوجودیکہ آشوبِ شہم میں مبتلا تھا مگر آپ کے استقبال کے لیے سوار ہو کر گیا اور نہایت اعزاز کے ساتھ آپ کو شہر میں لایا۔“

سیر العارفين کے مصنف شیخ ابوالفتح کی بادشاہوں سے ملاقات، اسکی غرض اور شاہوں کے طرز عمل کی روداد کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ صوفیاء اگر کبھی شاہوں کے دربار میں گئے تو دو مقاصد کے علاوہ تیسرا کوئی مقصد نہ تھا، ایک تبلیغ حق اور وعظِ نصیحت دوسرے حاجتمندوں کی حاجت برآری کے لیے

درنہ صوفیاء کرام کو نہ کبھی شاہی دربار سے دلچسپی رہی اور نہ شاہوں سے ملاقات کا شوق تاریخ کی گواہی دیکھئے۔

شیخ زکین الدین ابو الفتح سلطان قطب الدین سے ملنے شاہی محل جاتے تو لوگوں کی ڈھیروں عرضیاں ہمراہ رکھتے، میسر می وینیر پر سلطان آپکا استقبال کرتا اور اندر لے جاتا، دوزانو ہو کر باادب آپ کے سامنے بیٹھ جاتا اور آپ کی تشریف آوری کو بہت بڑی عنایت اور نعمت تصور کرتا، آپ اپنے خادم کو حکم دیتے کہ وہ لوگوں کی عرضیاں لائے، سلطان تمام عرضیوں کو پڑھتا، مناسب حکم دیتا اور آپ اس وقت تک واپس نہ جاتے جب تک مخلوق کے تمام معاملات طے نہ ہو جاتے۔

اسی مصنف نے شیخ جلال الدین تبریزی کے ساتھ سلطان شمس الدین التمش کے حسن عقیدت کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

”شیخ تبریزی بغداد سے دار الخلافہ دہلی آئے تو سلطان شمس الدین التمش نے دہلی سے باہر آ کر آپ کو خوش آمدید کہا جب آپ ابھی دور ہی تھے، سلطان کی نظر پڑی تو احتساراً گھوڑے سے اتر پڑا اور والہانہ انداز میں مصافحہ کیا۔“

تاریخ کے صفحات میں ہمیں ایسے واقعات جا بجا ملتے ہیں جو اس امر کی مستند گواہی کی حیثیت رکھتے ہیں کہ مسیوں شہنشاہ ان بندگان خدا کی خدمت اور ارادت کو اپنا قیمتی اثاثہ تصور کرتے اور ان سے تعلق کو عزت سمجھتے تھے، سچ ہے جو خدا کا ہو گیا دنیا اسی کی بن گئی، جو اس سے پھر دنیا بھی پھر گئی، ان حقائق کا انکار کیوں کر ممکن ہے کہ وقت کے باجبروت سلاطین نے صوفیاء و اولیاء کی عقیدت کا قلاوہ اپنے گلے میں ڈالا اور اسے موتیوں کا ہار سمجھا، ہر چہ جانے والی رات اور نکلنے والا دن انکی عقیدت

ارادت میں برابر اضافہ کرتا جاتا، شہنشاہ ہند فیروز تغلق کو شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی سے بے حد عقیدت تھی، سلطان علاؤ الدین خلجی، خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا مرید تھا، جلال الدین خلجی بھی آپ سے نیاز مندی کا شرف رکھتا تھا، سلطان احمد خان بہمنی، سید محمد گیسو دراز کا ارادت مند تھا، والی ہرات شاہ حسین خواجہ عبید اللہ احرار کا معتقد اور باقاعدہ آپ کے سلسلے سے منسک تھا۔ حاکم بیجا پور ابراہیم عادل شاہ ثانی پیر ہاشم گجراتی کا ارادت کیش تھا، سلطان نصیر الدین ہمایوں شیخ حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کے عقیدتمندوں میں سے تھا، یہ اور ایسی سینکڑوں مثالیں ہمارے مدعا کو واضح کرتی ہیں کہ بوریہ نشینی میں عرش نشینی کا مزہ صوفیاء نے لوٹا ہے اور یوں فقر کی لالچ رکھی۔

سلطان محمد جلال الدین اکبر جسے مستظلم، مدبر، صاحب کز و فر اور شان و شکوہ کے لحاظ سے "مغل اعظم" کہا جاتا ہے، اپنی تمام تر سطوت و وجاہت کے ساتھ فقر ا کی جھگیوں کا طواف کرتا اور اس طرح تاریخ کا ایک نیا اور زریں باب رقم ہوتا، وقت کا شہنشاہ جو پچاس برس تک پورے وید بے سے حکومت کرتا رہا۔ فقیروں کے ہاں یوں نظر آتا کہ وہ خادموں میں سے ایک ہے، جب آتا تو دہن سے سکندری نکال کر آتا اور دل میں بجز ارادت و جذبہ خدمت کے اور کچھ نہ ہوتا، صدر الصدور شیخ عبد الباقیؒ کے ساتھ اکبر کی ارادت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ :-

"ایک دفعہ جوتے اُن کے سامنے اٹھا کر رکھے، شہ

ولی الہند خواجہ اجمیریؒ کے ساتھ عقیدت و ارادت ذیل کے الفاظ سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

"اکبر سال بسال اجمیر جاتا کوئی مہم ہو یا اس کے علاوہ بھی، ایک منزل سے پیادہ پا جاتا اور بعض منتیں (خصوصاً جہانگیر کے تولد سے پہلے) تو ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک پیادہ گیا" شہ

اکبر بادشاہ شیخ سلیم حشری کا بھی بے حد معتقد تھا، شیخ سلیم ہی کے نام پر اپنے بیٹے کا نام سلیم رکھا جو بعد میں شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا، شیخ سلیم بابا فرید شکر گنج کی اولاد سے ہیں، حجاز، روم، بغداد اور نجف کی سیاحت فرمائی، بعد ازاں فتح پور سیکری میں اقامت پذیر ہوئے۔ اکبر نے سلیم کی پیدائش کے دو برس بعد شیخ سلیم حشری سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طریقے پر کیا۔

”خانقاہ شیخ کو روحانی و عرفانی چشمہ جان کروہاں ایک شہر تعمیر کروایا چنانچہ ۱۵۷۱ء میں فتح پور کی شاندار عمارتیں منی شروع ہوئیں اور یہ معمولی گاؤں شہنشاہ ہند کا پایہ تخت ہو گیا۔“

خواجہ محمد زبیر سرہندی المتوفی ۱۱۵۱ھ سے امرار اور اعیان سلطنت کی عقیدت و ارادت کی یہ کیفیت تھی۔

جب شیخ مکان سے مسجد تشریف لے جاتے تو امرار راستہ میں دو سالہ اور رومال بچھا دیتے کہ آپ کا پاؤں زمین پر نہ پڑے۔“ لہ  
حجۃ اللہ فی اللہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے مختلف مشائخ کرام سے بڑے بڑوں کی ارادت کا حال بیان فرماتے ہیں، شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کا کہنا ہے :-

جب شیخ آدم بنوری کی شہرت عام ہوئی تو دھوم شاہ جہان تک پہنچی، شاہ نے وزیر سعد اللہ خان اور ملا عبدالملکیم سیالکوٹی کو بھیجا تاکہ حقیقت حال کا علم ہو، دونوں شیخ کی خدمت میں پہنچے، شیخ مراقبہ میں تھے، کافی دیر دروازے پر بیٹھے رہے، جب شیخ حالت مراقبہ سے باہر نکلے تو دونوں آپ کے حجرے میں داخل ہوئے، شیخ ان کی تعظیم بجا نہ لائے یہ دیکھ کر دونوں بگڑ گئے، سعد اللہ خان نے کہا میں تو اہل دنیا میں سے

ہوں مگر ملاحظہ الحکیم تو عالم دین ہیں ان کی تعظیم ضروری ہے آپ نے جو ابا ارشاد فرمایا حدیث میں وارد ہے۔

العلماء أمناء الدین مالم یحافظوا الملوک ماذا خا لظروهم  
فہو اللصوص۔

اعلام دین متین کے پریدار اور محافظ ہیں جب تک صحبتِ امراء سے دور رہیں جب انہیں صحبتِ امراء اس آجائے تو وہ چور ہیں“ ۱۲۷  
”ایک دن بہمن یار خان لباس ماخرہ زیب تن کر کے حضرت خواجہ میر خورشید صاحب سیر الاولیاء کی خدمت میں آیا۔ اس وقت آپ کے گھر میں کوئی فرش نہیں تھا لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، بہمن یار خان بھی زمین پر بیٹھ گیا۔ حاضرین میں سے کوئی شخص اٹھا اور خواجہ کے کان میں کہا ”یہ بہمن یار خان ہے اس کی تعظیم کرنی چاہیے“ خواجہ صاحب نے باواز بلند فرمایا ”اگر بار ہے تو محتاج تعظیم نہیں اگر غیر ہے تو لائق تعظیم نہیں“ ۱۲۸  
حضرت میاں میر قادری لاہوری کے دروازے پر بھی کئی بار شاہوں نے دستک دی اور نیاز بجالائے، آپ کے عقیدہ مندوں میں سر فرست شاہ جہان کا نام ہے۔ آپ کے ساتھ شاہ جہان اور شہزادہ بلند اقبال کی عقیدت کس قدر تھی؟ تاریخ میں اس کا متعدد جگہوں پر ذکر ملتا ہے، تذکرہ مشائخ قادریہ کے مولف لکھتے ہیں۔

”جب شاہ جہان لاہور آیا تو شہزادہ بلند اقبال بھی اس کے ساتھ حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا، دوسری بار دس مہینے بعد جب شاہ جہان حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت بھی شہزادہ ہمراہ تھا اس وقت شہزادہ کی ارادتمندی کا یہ عالم تھا وہ آپ کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں آپ کا قیام تھا رہتا گیا اور جو لوگ وہ چبا کر کھینکتے جاتے

تھے انہیں اٹھا کر کھاتا رہا۔" گلہ

حضرت شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی جو اس صدی کی بڑی بااثر و حسانی شخصیت گذری ہیں اپنی درویش منشی، سادگی، غیرتِ فقر اور تلہیت کے باعث خاصی مشہور ہیں، آپ کے در دولت کو نبجانے کتنے امیروں، رئیسوں، نوابوں اور منصب داروں نے چوما کتے گج کلاہ سلامی دینے آئے اور کتنے سریر آراء جاروب کش بنے، آپ کی کشش کا یہ عالم تھا کہ ایک زمانہ امنڈ اچلا آتا، مسلمان امراء کا تو کسی کتنا غیر مسلم ارکانِ سلطنت کو کبھی آپ سے ملنے کا اشتیاق رہا اور دل میں جذبہ عقیدت موجزن رہا، برصغیر پاک و ہند کے نامور مصنف اور عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ صوبجات متحدہ اگرہ داودھ کے لیفٹیننٹ گورنر نے آپ سے ملنے کی اجازت چاہی آپ نے لوگوں سے فرمایا میں تو ایک فقیر آدمی ہوں ان کے بیٹھنے کا کیا انتظام ہوگا، اچھا ایک کرسی منگا لینا، لیفٹیننٹ گورنر کی طرف سے تاریخ اور وقت بھی مقرر ہو گیا اور آپ لوگوں سے یہ کہہ کر بھول بھی گئے، یہاں تک کہ لیفٹیننٹ گورنر جمعہ چند حکام اعلیٰ موجود ہوئے سب گھڑے تھے ایک میم بھی کھڑی تھی شیخ نے اسے گھڑے کی طرف اشارہ فرمایا کہ "بی تو اس پر بیٹھ جا" لیفٹیننٹ گورنر نے کچھ تبرک مانگا۔ آپ نے ایک خدام سے فرمایا کہ بھائی دیکھو میری ہنڈیا میں کچھ ہو تو ان کو دے دو، اس میں سے کچھ چورا مٹیائی کا لکلا بس سب کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیا، سب نے ادب اور خوشی سے قبول کیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے چلتے وقت نصیحت کی درخواست کی فرمایا "ظلمت کزناڑا ملے"



ان تمام تاریخی، مستند اور مضبوط حوالوں سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ  
من تو اضح لله بفضله الله، جو خدا کے ہاں سرنگوں ہو، خدا سے سر بلند  
کرویتا ہے، خادم بن کر رہنے سے خدا مخدوم بنا دیتا ہے، صوفیاء نے بلاشبہ  
یہی طریقہ اختیار کیا تو اللہ نے انہیں عزیز جہاں بنا دیا۔



<http://t.me/Tehqiqat>

# تعلیمات تصوف

اب تک ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ تصوف شریعت کے علاوہ یا اس سے ہٹ کر کوئی ادارہ یا تحریک نہیں بلکہ شرعی احکام و مسائل کے ضمن میں لوگوں کے اندر آمادگی اور شوق ابھارنا تصوف کا اصل کام ہے یوں تو نماز ادا کرنے اور روزے کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے لیکن تصوف حضور قلب پیدا کرنا چاہتا ہے روزے کے ساتھ ضبط نفس کا اہتمام تصوف کا مقصد ہے، زکوٰۃ ادا کرتے وقت سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دینے کا عزم تصوف کے پیش نظر ہے، تصوف حج کو دنیا کے غیر ضروری مشاغل اور بھنبھٹوں سے آزاد کر دینے کا ذریعہ بنا دینا چاہتا ہے، اسی طرح دیگر تمام قرآنی و واجبات کے سلسلہ میں تصوف کی نظر اس کی اصل غایت اور روح پر رہتی ہے۔

اسلام جب ایک تحریک اور انقلاب کے طور پر دنیا کے سامنے آیا اور دنیا کے بیشتر حصے میں حکمران دین کے طور پر متعارف ہوا تو یہ باقاعدہ ایک ایسا ادارہ بن گیا۔ جس کے کئی شعبے ہوں اسلام محض مذہب ہوتا تو اس کے پیروکاروں کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ زاہد مریاض، عبادت گزار، شب بیدار اور تسبیح خوان بن جائیں لیکن یہ دین تھا اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر عادی اور محیط تھا، اس دین کے لیے ضروری تھا کہ اس کے ماننے والوں میں جرنیل بھی ہوں اور سیاستدان بھی، عابد و زاہد بھی ہوں اور عالم اور محقق بھی، مفسرین کی ایک جماعت بھی ہونی چاہیے اور محدثین کی بھی تنظیمیں

اسلام کے گروہ کی ضرورت بھی تھی اور فلسفیانِ اسلام کی بھی، سو وقت گزرنے اور دائرہ اسلام وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ یہ تمام شعبے خود کفیل ہوتے چلے گئے، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، فلسفہ، منطوق، مناظرہ، سیاسیات، سپہ گری اور سفارت کاری یہ اور ایسے دیگر علوم و فنون مستقل حیثیت اختیار کر گئے، اسلام بین الاقوامی دین بنا تو بین الاقوامی تعلق بھی پیدا ہو گئے، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بے پناہ صلاحیت کار کی ضرورت تھی، اس امر سے ہر شخص متفق ہے کہ جو چیز جتنا اپنا دائرہ اثر وسیع کر لیتی ہے اس میں اتنی ہی کمزوری پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں فطرتاً ایسا ہو ہی جاتا ہے، یہ کچھ اسلام کے اندر بھی ہوا، اسلام کا اصل مدعا اور مقصود حقیقی دنیا کے لیے بہترین اور باصلاحیت انسان فراہم کرنا تھا اور اسلام نے اس مقصد کو کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا، لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ مختلف شعبے اپنے نام کے ساتھ تو قائم رہے لیکن مقصدیت کا فقدان صاف طور پر محسوس ہونے لگا، اسلام صرف لشکر و سپاہ ہی پر اکتفا نہیں کرتا، وہ لشکر و سپاہ کو مجتذ اللہ کے روپ میں دیکھنا چاہتا، اسلام قرآن اور اس کی تفسیر کے ضمن میں محض شان نزول، اقسام وحی، تقسیم سورا، ناسخ و منسوخ، آیاتِ مکیہ و مدنیہ، تادیل و تعبیر، حروف مقطعات اور حکامات و تشابہات کے علم کو کافی نہیں سمجھتا، جب تک کہ روح قرآن دل میں نہ اتر جائے، وہ ایسے محدثین چاہتا ہے جو امدادِ حدیث کے ضعیف و قوی، صحیح و حسن اور ناسخ و منسوخ جاننے کے ساتھ ساتھ مزاج شناس رسول ہوں تاکہ اطاعت میں محبت کی کیفیت پیدا ہو جائے، اسلام فقہاً اصل میں انہیں سمجھتا ہے جو نرے طہارت و وضو، بیع و شرا، قراض و رہن اور لیعان و ظہار کے مسائل ہی نہ جانتے ہوں، بلکہ انہیں دین کی حکمت سے پوری واقفیت ہو اور دل و جان سے اس علم پر عمل کرنے والے ہوں اور اسی طرح اسلام کا فلسفہ اور علم کلام کے ضمن میں بھی اپنا ہی مزاج ہے، مگر

اسلامی حکومت کی حدود میں وسعت، پیر و کاروں کی ان گنت تعداد، مختلف ملکوں کے تمدن کے اثرات، دیگر قوموں کی عادات اور مقامی رسوم و روایات کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر مختلف اثرات مرتب ہوئے، نتیجے کے طور پر صورت میں تو پتلا تبدیلی نہ آئی البتہ معنی بدل گئے، یوں تو مسلمانوں میں اچھے جرنیل بھی تھے، معزز اور محدث بھی، متکلم بھی اعلیٰ درجے کے اور مناظر بھی بلند پایہ، فقہاء کی کمی بھی نہ تھی اور سیاستدانوں کی بھی، لیکن معیاری انسان کم سے کم تر ہوتے چلے گئے، ایسے انسان جن میں تقویٰ، اخلاص، مردت، صبر، سماعت، فتوت، انکساری، بذل و سخا، سوز و گداز، رفیق و لطف، عفو و درگزر، ملہیت، قناعت، صدق، سادگی، توکل اور تسلیم و رضا کے اوصاف بدرجہ اتم ہوں، کہ یہی معراج انسانیت اور مقام آدمیت ہے۔

تصوف کو یا قاعدہ ایک ادارے اور تحریک کی شکل دینے کی ضرورت محض اس لیے پیش آئی کہ وہ متذکرہ صدر کام سرانجام دے کہ جو شخص جیسا اور جس شعبے میں ہے وہیں رہے لیکن اس میں بنیادی انسانی اوصاف و خصال اور اخلاق فاضلہ کا ہونا سب سے اہم چیز ہے۔

تصوف نے جو بھی خدمات سرانجام دیں اور جس بھی درجے میں اپنے اثرات چھوڑے اس سے یہ تو نہیں ہوا اور نہ تصوف اس کا دعویٰ ہے کہ تفسیری نکات اور مدثنہ اصطلاحات میں اضافہ ہوا ہو، فقہی ابواب کی از سر نو ترتیب ہوئی ہو، علم کلام کے نئے ادارے وجود میں آئے ہوں بلکہ اس سے انکار بہت ہی دشوار ہے کہ تصوف نے دنیا کو مخلص، بے ربا، باخدا، متواضع، راستباز، دردمند، غیور و جسور، متوکل قانع، صابر و شاکر، سادہ اور ایثار پیشہ انسان مہیا کیے ہیں۔

مختلف علوم و فنون پر جب ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جانے لگیں لیکن ان کا انسانی اخلاق سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا زیادہ سے زیادہ انہیں داویٰ تحقیق ہی

دی جاسکتی تھی تو صوفیاء نے اسے عبث کام سمجھتے ہوئے لوگوں کو ہدایت کے بنیادی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کی تعلیمات سے روشناس کرایا ایک محقق جب کتاب لکھتا تو ان مسائل کی تحقیق و جستجو کرتا، جبر و قدر، خلق قرآن، ملائکہ اور جنات کا وجود، جنت کی ماہیت، رفع عیسیٰ، ولادت مسیح اور ایسے ہی دیگر مسائل، لیکن صوفیاء نے ان مسائل کے مقابلے میں توبہ و انابت، زہد و ورع، خشوع و خضوع، تسلیم و رضا، صبر و شکر، توکل علی اللہ، عجز و انکسار، فقر و قناعت، معزم و استقامت، ایثار و اخلاص، صدق و صفا، خوف و خشیت اور حکمت و بصیرت ایسے مضامین کو اپنی کتابوں کی زینت بنایا۔

اب یہ ہر معقول شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ انسانیت کو کن مضامین اور ایک معیاری انسان بننے کے لیے کن مسائل کی ضرورت ہے۔

بناد بریں ہم نے روح تصوف کے ضمن میں ضروری سمجھا کہ تصوف کی اصل تعلیمات کا ایک باب بھی ہونا چاہیے تاکہ تعلیمات کے ذریعے تصوف کا اصل تعارف ہمارے سامنے آجائے چونکہ اخلاق عالیہ کی ایک اعلیٰ فہرست ہے اور ہر عنوان پر بحث بات کو طویل بنا دے گی، اس لیے چند ایک عنوانات منتخب کر لیے گئے ہیں اور ان پر بھی مختصر گفتگو کی گئی ہے، ان میں توکل، فقر، توبہ، تقویٰ، اخلاص، صبر، فتوت شامل ہیں۔

# توکل

**توکل** تصوف کی تعلیمات میں سب سے نمایاں اور اہم مقام 'توکل' کو حاصل ہے بلکہ یوں کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ توکل فی الاصل تصوف کا دوسرا نام ہے، یہی وہ صفت ہے جو انسان کے اندر خود اعتمادی پیدا اور قوت کار میں اضافہ کرتی ہے، اور ثمرات کی خیر سنی اور لذت کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر کوئی شیخ طیب نہیں، اس لیے کہ بندہ اپنی تمام محنت و مشقت، جدوجہد اور سعی و کوشش کے بعد جب نتائجِ الشکر پر چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سامان و گمان سے بڑھ کر اپنے بندہ کو عطا کرتا ہے، صفت توکل کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ قرآن مجید میں اسلام اور ایمان دونوں کو توکل کے ساتھ لازم و ملزوم دکھایا گیا ہے؛ مثلاً -

فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین -

اس پر توکل کرو اگر تم مسلمان ہو۔

نیز ارشادِ خداوندی ہے :-

وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین -

پس اللہ پر توکل کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

توکل کا نہ صرف اسلام اور ایمان کے ساتھ چولی و امن کا ساتھ ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے، انبیاء علیہم السلام جہاں اپنے لیے توکل علی اللہ کو ضروری قرار دیا وہاں اپنی امت کو بھی اسی کی تعلیم دی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا -

فعلى الله توكلت

پس میں نے اللہ پر توکل کیا۔

حضرت شعیبؑ کا فرمانا ہے :-

على الله توكلنا

ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو توکل کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں -

يا قوم ان كنتمو آمنتمو بالله فعليه توكلوا -

(اے میری قوم، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو۔)

اسی طرح سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اسی توکل علی اللہ کو اپنا اور صنا بھونا

قرار دے لیا تھا اور آپ ہر مقام پر سیکر توکل نظر آتے ہیں حال دونوں میں توکل

کا رنگ نمایاں ہے، کہیں آپ کو اللہ پر توکل کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، کہیں آپ کی

زبان سے اللہ پر توکل کرنے کا اظہار کروایا جا رہا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ربانی ہے :-

وتوكل على العزيز الرحيم

اور آپ خدائے قادر و رحیم پر توکل کیجئے۔

دوسرے مقام پر آتا ہے :-

قل هو ربي لا إله الا هو عليه توكلت واليه متاب

آپ فرمادیں گے وہ میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے

اسی پر توکل کر لیا اور اسی کے پاس مجھے جانا ہے۔

غرضیکہ تمام انبیاء علیہم السلام اپنے طور پر خود بھی متوکل علی اللہ رہے اور دوسرے

کو بھی اسی کی برابر تعلیم دیتے رہے۔

اب ہمیں تفصیل میں جائے بغیر دیکھنا یہ ہے کہ توکل کا حقیقی مفہوم کیا ہے ؟  
قرآن و سنت توکل کے بارے میں کیا رہنمائی کرتے ہیں ؟ کیا تصوف میں توکل کی تعلیم  
قرآن و سنت کے عین مطابق ہے ؟ سب سے پہلے ذہن کو اس بارہ میں مکیو ہو جانا  
چاہیے کہ توکل ایسا سچ بن کر رہنے، معطل الاعضا بن جانے، کام چوری، سستی، کاہلی،  
ہنگامہ کائنات سے فرار اور معاشرتی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کا نام ہرگز نہیں بلکہ مختصر  
الفاظ میں توکل تمام ذرائع و وسائل کو استعمال میں لا کر، امور معاشرت میں پوری دلچسپی  
لے کر، کامل تندرہی اور مکمل عرق ریزی سے کام کر کے نتائج کو اللہ کے سپرد کر دینے کا  
نام توکل ہے، اور یہ یقین اور ایمان اپنے اندر پیدا کر لینا کہ یہ تمام مظاہر محض وسائل  
ہیں حقیقی نتیجہ خیزی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ قرآن مجید میں توکل کا مفہوم یہی  
ہے کہ پوری کوشش اور محنت کے بعد نتائج اللہ پر چھوڑ دینا، مثلاً حضرت شعیب علیہ  
السلام نے مدتوں ان کو تبلیغ و تلقین کی، اور اس سلسلے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا  
حضرت نوح علیہ السلام مسلسل کئی برسوں تک لوگوں کو تلقین و تبلیغ کرتے رہے اور کوئی  
دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا، جتنا ایک انسان کے بس میں ہو سکتا تھا وہ شعیب علیہ السلام  
نے کیا اور پھر آخر میں فرمایا :-

ان ارید الا صلاح ما استطعت وما تعفنی الا باللہ علیہ

توکلت و الیہ اُنیب ۔

میں نے تو جہاں تک ممکن ہے اصلاح کا ارادہ کیا ہے اور مجھے توفیق

اللہ ہی سے ملی ہے اس پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع

کرتا ہوں۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ہے ۔

و شاورہم فی الامر فاذا عنمت فتوکل علی اللہ

marfat.com



اور تم حکومت کے معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کر لیا کرو اور اس کے نتیجے میں، جب کسی بات کا پکا ارادہ کر لو تو پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔  
 المنقرتہ آن مجید میں کہیں عزم کے بعد کہیں بقدر وسعت و طاقت اصلاح قوم کے بعد توکل کا اعلان کیا گیا ہے، پتہ چلا کہ کوشش نہ کرنا اور وسائل کام میں نہ لانا اور پھر اُسے توکل کا نام دینا قرآنی نصوص کے خلاف ہے۔ اعتقاداً تم توکل کی حدیث زبان زد خاص و عام ہے، اس کائنات میں سرور عالم سے بڑھ کر کون متوکل ہو گا مگر کسب آپ کی سنت ہے اور آپ برابر اس کی تلقین فرماتے رہے۔ اس ضمن میں امام ابو القاسم قشیریؒ نے بڑی بصیرت افزا اور خوبصورت بات کہی ہے۔

ان التوکل محلہ القلب والحركة بالظاہر لا تنافی التوکل بالقلب۔

توکل کا مقام دل ہے لہذا اس صورت میں ظاہری حرکات توکل کے منافی نہ ہوں گی۔

توکل دو حالتوں سے کبھی خالی نہیں ہوتا، ایک صبر، دوسرے شکر، اگر عام نتائج متوکل کی منشاء کے مطابق پیدا ہوں تو شکر کا مقام ہے اگر ایسا نہ ہو تو صبر کرنا چاہیے ظاہر ہے دونوں باتیں ایمان کی شاخیں ہیں۔ بنا بریں شیخ ابوسعید خدریؒ نے توکل کو اضطراب بلا سکون اور سکون بلا اضطراب کا نام دیا ہے۔

جب ہم اہل تصوف کی سیرتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان نفوس قدسیہ میں توکل یوں رچا ہوا تھا۔ جیسے رگوں میں خون! یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ہر حال میں خوش حشرم رہے، مصائب و آلام کی آندھیاں انہیں متزلزل نہ کر سکیں، مشکلات اور رکاوٹیں ان کا راستہ نہ روک سکیں، خدا پر اعتماد اور توکل کا نتیجہ تھا کہ زندگی بھر ان کی پیشانی کسی امیر کے دروازے کی آلودگی سے بچی رہی، کسی بادشاہ کے شرمندہ

احسان نہ ہوئے، وہ جو کے ان چھنے آٹے کی روٹی میں مرغ و ماہی کی لذت محسوس کرتے رہے۔ ببول کے کانٹوں سے اٹے راستوں پر چلتے ہوئے باغ کی روشوں پر آہستہ خرامی کا مزہ لیتے رہے، ایک ہی پھٹی پرانی کمبل کو اوڑھنا بچھونا بنا کر لیٹنے کے باوصف بنجاب و سمور کے نرم و گداز بستروں کا لطف اٹھاتے رہے، کھاری اور گرم پانی حلق سے اندھیلنے پر آب کوثر و تسنیم کا حظ حاصل کرتے رہے، گھاس پھوس کی شکستہ جھونپڑی میں شاہی ایوان و محل کا نظارہ کرتے رہے، وہ پاک بازار قدسی صفات لوگ اپنا سب کچھ خدا کے سپرد کر کے خود دارین کھیلوں سے آزاد ہو گئے۔ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس میں آلودہ نہ ہوئے اور خلق سے تعلق جوڑ لینے کے باوجود بھی مخلوق سے بے تعلق نہ ہوئے، وسائل کو مصرف میں لائے، ذرائع اختیار کیے مگر نظر ذاتِ خدا پر رہی، پانی سے پیاس بجھانی ضرور مگر ساقی حقیقی خدا کو جانا، روٹی سے پیٹ ضرور بھر مگر رازق برحق خدا کو سمجھا، بیماری میں علاج ضرور کرایا مگر شافی و مطلق خدا کو کہا، یہ ہے وہ توکل جو تصوف کے عناصر ترکیبی کا نمایاں عنصر ہے، اگر اسے فرار، کاہلی، کلم کوشی، عاقبت پسندی اور سہل انکاری کا نام دے لیجے تو ایسا ضرور کیجے مگر دنیا کو بتلا دیجے کہ حقیقی توکل کیا ہے؛ اب ہم قدیم صوفیاء کرام کی مستند تالیفات و تصنیفات سے واضح کریں گے کہ ان کے نزدیک توکل کا کیا مفہوم تھا؛ کیا ان کی تشریحات قرآن و سنت کے معیار پر پوری اترتی ہیں تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔ مشہور صوفی حضرت سہل بن تری فرماتے ہیں:-

”اللہ کے سامنے ایسا ہونا کہ جدھر چاہے کھینچ لے جائے توکل کھلاتا ہے“۔

ابو عبد اللہ قرشی فرماتے ہیں:-

”توکل یہ ہے کہ تو اللہ کے سوا اوروں کے پاس پناہ لینا چھوڑ دے“۔

جناب ابو بکر شبلیؓ کا کہنا ہے :-  
"توکل عمدہ قسم کی گد اگری ہے۔"

جناب سہل بن عبد اللہ تستریؓ فرماتے ہیں :-  
"متوکل کی تین قسمیں ہیں۔ نہ تو کسی سے مانگے، نہ رو کرے، اور نہ جمع رکھے۔"  
حضرت یحییٰ بن معاذؓ سے پوچھا گیا "انسان متوکل کب بنتا ہے؟ فرمایا:-  
"جب وہ اللہ کو اپنا دکیل بنانے پر راضی ہو جائے۔"

امام ابو عمر کا کہنا ہے کہ :-  
"خدا کے سوا ہر شے سے ترک تعلق کا نام توکل ہے۔" نیز فرماتے ہیں کہ :-  
"بندہ اپنے بدن کے قوام اور تنگی و تکلیف کا خدا کے سوا کسی سے ذکر  
نہ کرے۔"

صوفیاء کرام نے اسباب و ذرائع کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا تاہم اسباب  
میں مسبب الاسباب کو بھول جانا، ان کے نزدیک بدترین فعل ہے اسی لیے شیخ  
حنیفہ بنداویؒ کے مرشد حضرت ابو حفص مداد کے بارہ میں آتا ہے، انہوں نے فرمایا:-  
"میں نے بیس برس تک اپنے توکل کو نظر نہ ہونے دیا اور ہر روز کسب  
معاش کے لیے بازار میں جاتا رہا۔"

بعض اجل صوفیاء کا کہنا ہے کہ متوکل کی مثال اس بچے کی ہے جو اپنی والدہ  
کے پستانوں کے سوا کسی جائے پناہ کو نہ جانتا ہو۔ یہی حال متوکل کا ہے اسے راہ طتی  
ہے تو صرف خدا کی۔

صوفیاء کرام کے نزدیک توکل کے مختلف درجات ہیں اسی طرح متوکلین کے  
بھی، شیخ ابو علی دقاقؒ ان کی تقسیم یوں کرتے ہیں :-

"پہلا مرتبہ توکل، دوسرا تسلیم اور تیسرا تفویض، اللہ کے وعدہ پر اطمینان

کہ وہ ضرور حاجت پوری فرمائے گا یہ توکل ہے، یہ عقیدہ کہ اللہ کو میری حالت کا بخوبی علم ہے اسے تسلیم کیا گیا، خدا کے ہر حکم پر رضا مندی، خواہ موافق ہو یا مخالف یہ درجہ تفویض ہے۔

صوفیائے سالار کارواں شیخ عبدالقادر جیلانی رُقمطراز ہیں۔

”اگر تو اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے تو تجھے تیرے حال کے موافق بے واسطہ روزی دے گا جیسے ایک طبیب مشفق اور حکیم عاقل مریض کو اس کے حسبِ حال غذا دیتا ہے“

ایک شخص حضرت ابو بکر شبلیؓ کے پاس آیا اور کثیر العیال ہونے کی شکایت کی، آپ نے فرمایا:-

”ان افراد کو گھر سے نکال دو جن کا رزق اللہ کے ذمہ نہیں“

حضرت سلیمان دارانی نے مکہ میں ایک شخص کو دیکھا جو سوائے آبِ زمزم کے چند گھونٹ کے علاوہ کچھ کھاتا پیتا نہ تھا، ایک دن آپ نے فرمایا فرض کرو، آبِ زمزم خشک ہو جائے تو پھر کیا کرو گے، اس پر اس شخص نے اٹھ کر آپ کے سر پر بوسہ دیا اور کہا خدا تمہیں نیک جزا دے تو نے مجھے راہِ راست پر لاکھرا کیا میں تو کئی دنوں سے آبِ زمزم کو پوجتا تھا“

وہب بن منبہ فرماتے ہیں:-

اگر آسمان بوسے کا اور زمین کالنسی کی ہو جائے (یعنی کچھ بھی پیدا نہ ہو اور میں دیکھوں کہ روزی کا غم میرے دل میں پیدا ہو گیا ہے تو میں مشرک ہو جاؤں گا۔

حضرت امام غزالیؒ نے توکل کے تین درجات بتائے ہیں:-

۱۔ متوکل حال اس شخص کی مانند ہو جس نے مقدمے میں کسی زیرک ذہین، فصیح،

بے باک اور مخلص وکیل کو مقرر کر لیا ہو اور اس پر کامل اعتماد کرتا ہو۔  
 ۲۔ متوکل کی حالت اس بچے کی سی ہے جو اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کو جانتا ہی نہیں۔  
 ۳۔ متوکل اس مردے کی طرح ہو جو غسل کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔  
 حضرت بایزید بسطامیؒ نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی، بعد از فراغت امام نے پوچھا یا حضرت آپ مانگتے بھی کسی سے نہیں اور کرتے بھی کچھ نہیں تو گذر بسر کیسے ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا ٹھہرو میں نماز کا اعادہ کر لوں کیونکہ جو اپنے رازق کو نہیں پہچانتا اس کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادریسؒ نے ایک راہب سے پوچھا کھاتے کہاں سے ہو؟ جواب ملا اس سے پوچھو جو کھانے کو دیتا ہے کہ وہ کہاں سے بھیجتا ہے مجھے کیا علم؟  
 یہی وہ جو اہر پارے جنہیں بغیر کسی اضافی تشریح اور حواشی کے من و عن پیش کر دیا گیا ہے جن سے ایک خاکہ ہمارے سامنے ابھرتا ہے اور صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ تصوف میں توکل کا بعینہ وہی مفہوم ہے جو قرآن و حدیث کی روشنی میں ہمیں نظر آتا ہے مختلف اقوال اور واقعات سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ توکل درحقیقت اسباب کے پر سے ہیں سبب الاسباب پر نگاہ رکھنے کا نام ہے اور اپنے آپ کو کلیۃً اللہ کی سپردگی میں دے دینا روحِ توکل ہے، اللہ پر کامل اعتماد اور یقین ہی دنیا و آخرت کی کامیابی و فلاح کا ضامن ہے، اسی لیے شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے کہ توکل یقین کا پل، ایمان کا ستون اور اخلاص کی منزل ہے۔

لکھیائے سعادت: ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲، ۱۶۰۳، ۱۶۰۴، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۰۸، ۱۶۰۹، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، ۱۶۱۲، ۱۶۱۳، ۱۶۱۴، ۱۶۱۵، ۱۶۱۶، ۱۶۱۷، ۱۶۱۸، ۱۶۱۹، ۱۶۲۰، ۱۶۲۱، ۱۶۲۲، ۱۶۲۳، ۱۶۲۴، ۱۶۲۵، ۱۶۲۶، ۱۶۲۷، ۱۶۲۸، ۱۶۲۹، ۱۶۳۰، ۱۶۳۱، ۱۶۳۲، ۱۶۳۳، ۱۶۳۴، ۱۶۳۵، ۱۶۳۶، ۱۶۳۷، ۱۶۳۸، ۱۶۳۹، ۱۶۴۰، ۱۶۴۱، ۱۶۴۲، ۱۶۴۳، ۱۶۴۴، ۱۶۴۵، ۱۶۴۶، ۱۶۴۷، ۱۶۴۸، ۱۶۴۹، ۱۶۵۰، ۱۶۵۱، ۱۶۵۲، ۱۶۵۳، ۱۶۵۴، ۱۶۵۵، ۱۶۵۶، ۱۶۵۷، ۱۶۵۸، ۱۶۵۹، ۱۶۶۰، ۱۶۶۱، ۱۶۶۲، ۱۶۶۳، ۱۶۶۴، ۱۶۶۵، ۱۶۶۶، ۱۶۶۷، ۱۶۶۸، ۱۶۶۹، ۱۶۷۰، ۱۶۷۱، ۱۶۷۲، ۱۶۷۳، ۱۶۷۴، ۱۶۷۵، ۱۶۷۶، ۱۶۷۷، ۱۶۷۸، ۱۶۷۹، ۱۶۸۰، ۱۶۸۱، ۱۶۸۲، ۱۶۸۳، ۱۶۸۴، ۱۶۸۵، ۱۶۸۶، ۱۶۸۷، ۱۶۸۸، ۱۶۸۹، ۱۶۹۰، ۱۶۹۱، ۱۶۹۲، ۱۶۹۳، ۱۶۹۴، ۱۶۹۵، ۱۶۹۶، ۱۶۹۷، ۱۶۹۸، ۱۶۹۹، ۱۷۰۰، ۱۷۰۱، ۱۷۰۲، ۱۷۰۳، ۱۷۰۴، ۱۷۰۵، ۱۷۰۶، ۱۷۰۷، ۱۷۰۸، ۱۷۰۹، ۱۷۱۰، ۱۷۱۱، ۱۷۱۲، ۱۷۱۳، ۱۷۱۴، ۱۷۱۵، ۱۷۱۶، ۱۷۱۷، ۱۷۱۸، ۱۷۱۹، ۱۷۲۰، ۱۷۲۱، ۱۷۲۲، ۱۷۲۳، ۱۷۲۴، ۱۷۲۵، ۱۷۲۶، ۱۷۲۷، ۱۷۲۸، ۱۷۲۹، ۱۷۳۰، ۱۷۳۱، ۱۷۳۲، ۱۷۳۳، ۱۷۳۴، ۱۷۳۵، ۱۷۳۶، ۱۷۳۷، ۱۷۳۸، ۱۷۳۹، ۱۷۴۰، ۱۷۴۱، ۱۷۴۲، ۱۷۴۳، ۱۷۴۴، ۱۷۴۵، ۱۷۴۶، ۱۷۴۷، ۱۷۴۸، ۱۷۴۹، ۱۷۵۰، ۱۷۵۱، ۱۷۵۲، ۱۷۵۳، ۱۷۵۴، ۱۷۵۵، ۱۷۵۶، ۱۷۵۷، ۱۷۵۸، ۱۷۵۹، ۱۷۶۰، ۱۷۶۱، ۱۷۶۲، ۱۷۶۳، ۱۷۶۴، ۱۷۶۵، ۱۷۶۶، ۱۷۶۷، ۱۷۶۸، ۱۷۶۹، ۱۷۷۰، ۱۷۷۱، ۱۷۷۲، ۱۷۷۳، ۱۷۷۴، ۱۷۷۵، ۱۷۷۶، ۱۷۷۷، ۱۷۷۸، ۱۷۷۹، ۱۷۸۰، ۱۷۸۱، ۱۷۸۲، ۱۷۸۳، ۱۷۸۴، ۱۷۸۵، ۱۷۸۶، ۱۷۸۷، ۱۷۸۸، ۱۷۸۹، ۱۷۹۰، ۱۷۹۱، ۱۷۹۲، ۱۷۹۳، ۱۷۹۴، ۱۷۹۵، ۱۷۹۶، ۱۷۹۷، ۱۷۹۸، ۱۷۹۹، ۱۸۰۰، ۱۸۰۱، ۱۸۰۲، ۱۸۰۳، ۱۸۰۴، ۱۸۰۵، ۱۸۰۶، ۱۸۰۷، ۱۸۰۸، ۱۸۰۹، ۱۸۱۰، ۱۸۱۱، ۱۸۱۲، ۱۸۱۳، ۱۸۱۴، ۱۸۱۵، ۱۸۱۶، ۱۸۱۷، ۱۸۱۸، ۱۸۱۹، ۱۸۲۰، ۱۸۲۱، ۱۸۲۲، ۱۸۲۳، ۱۸۲۴، ۱۸۲۵، ۱۸۲۶، ۱۸۲۷، ۱۸۲۸، ۱۸۲۹، ۱۸۳۰، ۱۸۳۱، ۱۸۳۲، ۱۸۳۳، ۱۸۳۴، ۱۸۳۵، ۱۸۳۶، ۱۸۳۷، ۱۸۳۸، ۱۸۳۹، ۱۸۴۰، ۱۸۴۱، ۱۸۴۲، ۱۸۴۳، ۱۸۴۴، ۱۸۴۵، ۱۸۴۶، ۱۸۴۷، ۱۸۴۸، ۱۸۴۹، ۱۸۵۰، ۱۸۵۱، ۱۸۵۲، ۱۸۵۳، ۱۸۵۴، ۱۸۵۵، ۱۸۵۶، ۱۸۵۷، ۱۸۵۸، ۱۸۵۹، ۱۸۶۰، ۱۸۶۱، ۱۸۶۲، ۱۸۶۳، ۱۸۶۴، ۱۸۶۵، ۱۸۶۶، ۱۸۶۷، ۱۸۶۸، ۱۸۶۹، ۱۸۷۰، ۱۸۷۱، ۱۸۷۲، ۱۸۷۳، ۱۸۷۴، ۱۸۷۵، ۱۸۷۶، ۱۸۷۷، ۱۸۷۸، ۱۸۷۹، ۱۸۸۰، ۱۸۸۱، ۱۸۸۲، ۱۸۸۳، ۱۸۸۴، ۱۸۸۵، ۱۸۸۶، ۱۸۸۷، ۱۸۸۸، ۱۸۸۹، ۱۸۹۰، ۱۸۹۱، ۱۸۹۲، ۱۸۹۳، ۱۸۹۴، ۱۸۹۵، ۱۸۹۶، ۱۸۹۷، ۱۸۹۸، ۱۸۹۹، ۱۹۰۰، ۱۹۰۱، ۱۹۰۲، ۱۹۰۳، ۱۹۰۴، ۱۹۰۵، ۱۹۰۶، ۱۹۰۷، ۱۹۰۸، ۱۹۰۹، ۱۹۱۰، ۱۹۱۱، ۱۹۱۲، ۱۹۱۳، ۱۹۱۴، ۱۹۱۵، ۱۹۱۶، ۱۹۱۷، ۱۹۱۸، ۱۹۱۹، ۱۹۲۰، ۱۹۲۱، ۱۹۲۲، ۱۹۲۳، ۱۹۲۴، ۱۹۲۵، ۱۹۲۶، ۱۹۲۷، ۱۹۲۸، ۱۹۲۹، ۱۹۳۰، ۱۹۳۱، ۱۹۳۲، ۱۹۳۳، ۱۹۳۴، ۱۹۳۵، ۱۹۳۶، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۰، ۱۹۴۱، ۱۹۴۲، ۱۹۴۳، ۱۹۴۴، ۱۹۴۵، ۱۹۴۶، ۱۹۴۷، ۱۹۴۸، ۱۹۴۹، ۱۹۵۰، ۱۹۵۱، ۱۹۵۲، ۱۹۵۳، ۱۹۵۴، ۱۹۵۵، ۱۹۵۶، ۱۹۵۷، ۱۹۵۸، ۱۹۵۹، ۱۹۶۰، ۱۹۶۱، ۱۹۶۲، ۱۹۶۳، ۱۹۶۴، ۱۹۶۵، ۱۹۶۶، ۱۹۶۷، ۱۹۶۸، ۱۹۶۹، ۱۹۷۰، ۱۹۷۱، ۱۹۷۲، ۱۹۷۳، ۱۹۷۴، ۱۹۷۵، ۱۹۷۶، ۱۹۷۷، ۱۹۷۸، ۱۹۷۹، ۱۹۸۰، ۱۹۸۱، ۱۹۸۲، ۱۹۸۳، ۱۹۸۴، ۱۹۸۵، ۱۹۸۶، ۱۹۸۷، ۱۹۸۸، ۱۹۸۹، ۱۹۹۰، ۱۹۹۱، ۱۹۹۲، ۱۹۹۳، ۱۹۹۴، ۱۹۹۵، ۱۹۹۶، ۱۹۹۷، ۱۹۹۸، ۱۹۹۹، ۲۰۰۰، ۲۰۰۱، ۲۰۰۲، ۲۰۰۳، ۲۰۰۴، ۲۰۰۵، ۲۰۰۶، ۲۰۰۷، ۲۰۰۸، ۲۰۰۹، ۲۰۱۰، ۲۰۱۱، ۲۰۱۲، ۲۰۱۳، ۲۰۱۴، ۲۰۱۵، ۲۰۱۶، ۲۰۱۷، ۲۰۱۸، ۲۰۱۹، ۲۰۲۰، ۲۰۲۱، ۲۰۲۲، ۲۰۲۳، ۲۰۲۴، ۲۰۲۵، ۲۰۲۶، ۲۰۲۷، ۲۰۲۸، ۲۰۲۹، ۲۰۳۰، ۲۰۳۱، ۲۰۳۲، ۲۰۳۳، ۲۰۳۴، ۲۰۳۵، ۲۰۳۶، ۲۰۳۷، ۲۰۳۸، ۲۰۳۹، ۲۰۴۰، ۲۰۴۱، ۲۰۴۲، ۲۰۴۳، ۲۰۴۴، ۲۰۴۵، ۲۰۴۶، ۲۰۴۷، ۲۰۴۸، ۲۰۴۹، ۲۰۵۰، ۲۰۵۱، ۲۰۵۲، ۲۰۵۳، ۲۰۵۴، ۲۰۵۵، ۲۰۵۶، ۲۰۵۷، ۲۰۵۸، ۲۰۵۹، ۲۰۶۰، ۲۰۶۱، ۲۰۶۲، ۲۰۶۳، ۲۰۶۴، ۲۰۶۵، ۲۰۶۶، ۲۰۶۷، ۲۰۶۸، ۲۰۶۹، ۲۰۷۰، ۲۰۷۱، ۲۰۷۲، ۲۰۷۳، ۲۰۷۴، ۲۰۷۵، ۲۰۷۶، ۲۰۷۷، ۲۰۷۸، ۲۰۷۹، ۲۰۸۰، ۲۰۸۱، ۲۰۸۲، ۲۰۸۳، ۲۰۸۴، ۲۰۸۵، ۲۰۸۶، ۲۰۸۷، ۲۰۸۸، ۲۰۸۹، ۲۰۹۰، ۲۰۹۱، ۲۰۹۲، ۲۰۹۳، ۲۰۹۴، ۲۰۹۵، ۲۰۹۶، ۲۰۹۷، ۲۰۹۸، ۲۰۹۹، ۲۱۰۰، ۲۱۰۱، ۲۱۰۲، ۲۱۰۳، ۲۱۰۴، ۲۱۰۵، ۲۱۰۶، ۲۱۰۷، ۲۱۰۸، ۲۱۰۹، ۲۱۱۰، ۲۱۱۱، ۲۱۱۲، ۲۱۱۳، ۲۱۱۴، ۲۱۱۵، ۲۱۱۶، ۲۱۱۷، ۲۱۱۸، ۲۱۱۹، ۲۱۲۰، ۲۱۲۱، ۲۱۲۲، ۲۱۲۳، ۲۱۲۴، ۲۱۲۵، ۲۱۲۶، ۲۱۲۷، ۲۱۲۸، ۲۱۲۹، ۲۱۳۰، ۲۱۳۱، ۲۱۳۲، ۲۱۳۳، ۲۱۳۴، ۲۱۳۵، ۲۱۳۶، ۲۱۳۷، ۲۱۳۸، ۲۱۳۹، ۲۱۴۰، ۲۱۴۱، ۲۱۴۲، ۲۱۴۳، ۲۱۴۴، ۲۱۴۵، ۲۱۴۶، ۲۱۴۷، ۲۱۴۸، ۲۱۴۹، ۲۱۵۰، ۲۱۵۱، ۲۱۵۲، ۲۱۵۳، ۲۱۵۴، ۲۱۵۵، ۲۱۵۶، ۲۱۵۷، ۲۱۵۸، ۲۱۵۹، ۲۱۶۰، ۲۱۶۱، ۲۱۶۲، ۲۱۶۳، ۲۱۶۴، ۲۱۶۵، ۲۱۶۶، ۲۱۶۷، ۲۱۶۸، ۲۱۶۹، ۲۱۷۰، ۲۱۷۱، ۲۱۷۲، ۲۱۷۳، ۲۱۷۴، ۲۱۷۵، ۲۱۷۶، ۲۱۷۷، ۲۱۷۸، ۲۱۷۹، ۲۱۸۰، ۲۱۸۱، ۲۱۸۲، ۲۱۸۳، ۲۱۸۴، ۲۱۸۵، ۲۱۸۶، ۲۱۸۷، ۲۱۸۸، ۲۱۸۹، ۲۱۹۰، ۲۱۹۱، ۲۱۹۲، ۲۱۹۳، ۲۱۹۴، ۲۱۹۵، ۲۱۹۶، ۲۱۹۷، ۲۱۹۸، ۲۱۹۹، ۲۲۰۰، ۲۲۰۱، ۲۲۰۲، ۲۲۰۳، ۲۲۰۴، ۲۲۰۵، ۲۲۰۶، ۲۲۰۷، ۲۲۰۸، ۲۲۰۹، ۲۲۱۰، ۲۲۱۱، ۲۲۱۲، ۲۲۱۳، ۲۲۱۴، ۲۲۱۵، ۲۲۱۶، ۲۲۱۷، ۲۲۱۸، ۲۲۱۹، ۲۲۲۰، ۲۲۲۱، ۲۲۲۲، ۲۲۲۳، ۲۲۲۴، ۲۲۲۵، ۲۲۲۶، ۲۲۲۷، ۲۲۲۸، ۲۲۲۹، ۲۲۳۰، ۲۲۳۱، ۲۲۳۲، ۲۲۳

# ”فقر“

لفظ ”فقر“ تنگدستی، غربت اور مفلسی کے معنوں میں آتا ہے یہی مفہوم قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ملتا ہے تاہم ایک حدیث میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کو اپنے لیے فخر قرار دیا، ظاہر ہے فقر کے مذکورہ بالا مفہوم میں جو تحقیر ہے اسے آپ اپنے لیے باعثِ توقیر قرار نہیں دے سکتے۔ اس لیے فقر کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

(۲) فقرِ اضطراری

(۱) فقرِ اختیاری

فقرِ اختیاری واقعہً قابلِ فخر ہے اور فقرِ اضطراری خدا کے عذاب کی ایک شکل اسی بحث کو اب ہم مزید طول نہیں دینا چاہتے، صرف فقرِ اختیاری پر دو چار ضروری باتیں کر کے ہم آگے چلیں گے،

فقرِ اختیاری کا مطلب یہ ہے کہ انسان تیش و تکلف اور آثالث و آرائش کے جملہ لوازمات حاصل ہونے کے باوجود رویشانہ زندگی بسر کرے، دولت جمع کرنے پر ایثار کو ترجیح دے، اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ایک نمایاں مثال ہے، مدنی زندگی کے آخری دور میں فتوحاتِ غنائم کے علاوہ خراج کی بڑی مقدار آپ کے ہاں پہنچ رہی تھی مگر اس سب کے ہوتے ہوئے آپ کی زندگی درویشی اور فقیری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اگرچہ آپ بادشاہِ عرب و عجم تھے مگر

وہی گھاس پھوس کا جھونپڑا، وہی پیوند لگا لباس، وہی روکھا سوکھا کھاجا، اور وہی دردناک  
 انداز زندگی، ظاہر ہے اگر یہی چیزیں یونہی مسلط ہو جائیں تو ایک عذاب ہیں، مگر انہیں  
 از خود اختیار کر لیا جائے تو سراسر سکون و اطمینان ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 اپنی امت کے لیے فقر و تنگدستی کا اندیشہ محسوس نہیں کیا بلکہ خوش بسری اور مرتزہ الحالی  
 کو دین کے لیے فتنہ قرار دیا، آپ برابر لوگوں کو قال اور حال سے فقر اختیار کرنے کی  
 تلقین فرماتے رہے، اپنا یہ عالم تھا کہ ہفتہ ہفتہ چولہا ٹھنڈا رہتا رہتا صاحبزادی کے ہاتھوں  
 میں کام کی کثرت کے باعث آبیے پڑ گئے مگر غلام عطا کرنے کے معاملے میں بدر کے  
 یتیموں کو ترجیح دی، خود فاتے سے ہیں مگر کوشش رہی کہ کوئی سائل دروازے سے  
 خالی نہ جانے پائے، اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کی ارواح مقدسہ بھی فقر اختیاری کے  
 قالب میں طہل گئی تھیں اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا ان کا شأ  
 بن گیا تھا۔ سارا دن روزے سے رہے مگر افطار کے وقت جب لقمہ منہ میں ڈالنے والے  
 تھکے چانک سائل کی صدا گونجی، لقمہ اٹک گیا اور حاضر سائل کو پیش کر دیا، اور پھر لقمہ  
 و سحر کے وہی روزہ دوسرے دن کسی یتیم کی ضرورت مقدم رکھی گئی، تیسرے دن قیدی  
 کی حاجت پوری کرنا ضروری سمجھا گیا۔ یہ سب واقعات فقر اختیاری کے عمدہ نمونے  
 ہیں۔ تصوف میں اس فقر کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے، صوفیاء کرام نے اپنی پوری  
 زندگی میں ہمیشہ تمول و تعیش پر فقر کو ترجیح دی، لیکن یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ  
 فقر صرف ترک دنیا و مال کا نام ہے اور اپنے نفس کو خواہ مخواہ دکھ میں رکھنا مقصود  
 ہے بلکہ فقر دراصل دل کے غنا کا نام ہے۔ حقیقی فقیر تب بنتا ہے جب اس کے لیے  
 دنیا و اسباب دنیا کا ہونا نہ ہونا برابر ہو، چنانچہ اس ضمن میں حضرت داتا گنج بخش  
 کا یہ فرمان ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ "فقیر کی اصل متاع دنیا کا ترک اور اس  
 سے علیحدگی نہیں بلکہ دل کو اس کی محبت سے خالی اور بے نیاز کرنا ہے، فقر وہ ہوتا ہے

جو متاعِ دنیا سے بالکل بے نیاز ہو، اس کے پاس خواہ سرے سے کچھ موجود نہ ہو۔ یا اس کے پاس دنیا کے سارے اسباب موجود ہوں دونوں میں سے کسی حالت میں کوئی نخل نہ آئے نہ کسی چیز کے مفقود ہونے پر اسے پریشانی لاحق ہو اور نہ جملہ اسباب موجود ہونے پر وہ اپنے آپ کو دولت مند محسوس کرے۔" علیہ

اگر تعمقِ نظر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ فقر کچھ مل جانے پر شکر اور نہ ملنے پر صبر کا نام ہے، نہ تو تنگدستی اور مفلسی فقر پر اثر انداز ہوتی ہے اور نہ خوش بگیری اور اور صرفہ الحالی، کیونکہ فقر اسباب کے مفقود ہونے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا براہِ راست رابطہ دل کے ساتھ ہے چنانچہ اس ضمن میں حضرت شیخ علی الجویری داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کو فقر اور مصیبت کی حالت میں کمال صبر کے باعث "نعم العبد" قرار دیا اور حضرت سلیمانؑ کو شکر نعمت کی بدولت "نعم العبد" فرمایا اور یا صبر ایوبؑ اور شکر سلیمانؑ دونوں بارگاہِ الہی میں یکساں ہیں۔" علیہ

اس سلسلے میں ضیاء الدین سروردی کی رائے بہت ہی دقیق اور مفید ہے فرماتے ہیں۔  
"فقر فاقہ کرنے یا کچھ نہ رکھنے کا نام نہیں بلکہ فقر محمود یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ رکھے اور جو کچھ خدا دے اس پر راضی رہے۔" علیہ

یہی وہ خدا کی رضا پر راضی ہونا ہے جسے بجا طور پر غنا "بے نیازی" کہا جاسکتا ہے جیسا کہ شیخ ابوبکر کتانیؒ فرماتے ہیں۔

"جب انسان حقیقی طور پر اللہ ہی کا محتاج ہو جاتا ہے تو پھر وہ حقیقی طور پر غنی باللہ ہو جاتا ہے۔" علیہ

جب انسان فقر اختیار کر لیتا ہے تو دارین کے دھندوں اور گھمیلوں سے نجات



پالیتا ہے اور زندگی میں جو سکھ اور چین اسے نصیب ہوتا ہے اسے بادشاہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوتا، شیخ ابوبکر وراق نے بڑی دل لگتی اور خوبصورت بات کہی ہے فرماتے ہیں،

”دنیا اور آخرت دونوں جہان میں فقیر کے لیے خوشخبری ہے، لوگوں نے جب پوچھی تو فرمایا، اس لیے کہ دنیا میں بادشاہ اس سے خرچ نہیں لیتا آخرت میں خدا حساب نہیں مانگے گا۔“

فقیر اس اعتبار سے لائق تحسین ہے کہ اس کے اور اللہ کے مابین تعلق میں کبھی خلل واقع نہیں ہوتا اور تقرب کی کیفیات میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ دو چیزیں ہی ایسی ہیں جو اس تعلق و تقرب میں خلل انداز ہوتی ہیں، نعمت مل جانے پر غرور ہونا اور چمن جانے پر شکوہ کرنا، فقیر کے ہاں ان دونوں کا گزیر نہیں ہوتا، کچھ نہ ملے تو وہ سکون محسوس کرتا ہے مل جائے تو اپنے لیے کچھ نہیں رکھتا جیسا کہ شیخ ابوالحسین زوری فقیر کی تالیف میں کہتے ہیں۔

”جب اس کے پاس کچھ نہ ہو تو اسے سکون حاصل ہوا اور جب کچھ مل جائے تو خرچ کر دے۔“

مال و اسباب کے موجود و مفقود ہونے کی دونوں حالتوں میں فقیر کی نگاہ کا مرکز ذاتِ خداوندی ہوتی ہے، فقیر کو لاکھوں کروڑوں مل جائیں تو وہ اپنے دل کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا ہے اُسے اپنے دل کے کسی گوشے میں غیر معمولی خوشی اور خدا سے عنایت کی کوئی رمت نظر نہیں آتی اگر اس سے تن کے کپڑے بھی چھین لیے جائیں تو اپنا چہرہ گھور گھور کر دیکھتا ہے مگر اس پر بے چینی اور شکایت کا اثر دور دور تک بھی دکھائی نہیں دیتا، حضرت داماد گنج بخش نے شیخ ابوالقاسم قشیریؒ کے بارے میں لکھا ہے:-

”میرے استاد قشیریؒ نے فرمایا مجھے اگر خداوند تعالیٰ غنی کرے تو میں

غافل ہونے کے بجائے اس کا شکر ادا کروں گا اور اگر وہ مجھے فقیر بنا دے  
تو زلیں اور منہ پھیرنے والا بننے کے بجائے صبر کروں گا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ فقیر دراصل دنیا میں دل کے نہاٹکنے اور  
کھینے کا نام ہے، اس حقیقت کو شیخ ابو بکر شبلیؒ نے ان الفاظ کا روپ دیا ہے "فقیر الی  
اللہ کی ادنیٰ علامت یہ ہے اگر اس کے پاس ساری دنیا ہو اور پھر وہ اسے ایک دن  
میں خرچ کر ڈالے اور اس کے بعد اگر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ وہ ایک دن کی  
خوراک رکھ لیتا (تو بہتر ہوتا) تو یہ فقر نہیں"۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ جس نے دنیا سے منہ موڑا اس کے قدموں پر دنیا ڈھیر ہوئی  
جس نے لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کا سوچا۔ لوگوں کا اردہام اس کی جانب دوڑا،  
جس نے فقر کو تو نگری بہ ترجیح دی، تو نگری نے اس کے قدم چومے، بڑی بعیرت افروز  
بات کہی ہے، جناب علی مرتضیٰ نے کہ دنیا سانسے کی مانند ہے۔ پیٹھ دے کر چلو تو خود بخود  
پھیپھے آئے گی، اسی باعث حضرت ابراہیم بن ادریسؒ کو کسنا پڑا۔

"عم نے فقر مانگا تو مالدار نے ہمارا استقبال کیا، لوگوں نے مالدار  
مانگی تو فقر (محتاج) نے اُن کا استقبال کیا"۔

اس بحث کے خاتمے پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی مستند کتابوں سے  
کچھ ایسے مختصر اور چند واقعات نقل کر دیے جائیں جس سے آسانی پتہ چل سکے کہ فقیر  
گڈرمی اور ٹھہ کر بیٹھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کیا محسوس کرتا اور کہاں موجود پاتا ہے،  
فقیر الی اللہ حبیب دنیا سے "غنی" بن کر فرشِ خاک پر بیٹھتا ہے تو وہ خود کو سدرہ نشین  
تصور کرتا ہے، ہاتھ خالی ہونے کے باوجود دولتِ دنیا کو پاؤں کی ٹھوک میں سمجھتا ہے اس  
کی آنکھ سیر، اس کا ذہن مطمئن اور اس کا دل غنی ہوتا ہے، ناقول پر فاقے ہوں تو سانس  
کبھی گھٹتی محسوس نہیں ہوتی، نہ جواہر قدموں پر نچاؤ ہوں تو دل کی دھڑکن کبھی تیز نہیں

ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ یہ دلی پوشی، بستے چھروں اور بکھرے بالوں والے، شاہان بے تاج اور خسروان بے کلاہ ہوتے ہیں۔ جب گڈری بہن لیتے ہیں تو دنیا بائیں اور آخرت دائیں نعل میں ہوتی ہے۔ ان کی شان قلندری، تاج سکندری کو ترچی نگاہ کہہ سکتی نہیں جانتی، ان کی فقیری، کوہن کی امیری کو پرکاہ کی حیثیت نہیں دیتی، ایسا کیوں نہ ہو، یہ لوگ خدا کے فقیر جو ہوئے، آدمی بے نظیر کیوں نہ ٹھہریں، اب آئیے اسن واقعات کی طرف جو ایک طرف بصیرت افزہ ہیں تو دوسری جانب وجدافریں اور ذوق افزہ بھی۔ جن کے ایک ایک شوشے سے غیرتِ فقیر چھلکی پڑتی ہے۔ شیخ ابوالقاسم قشیری رقمطراز ہیں:-

شیخ ابوعلی دقاقؒ کے پاس ایک فقیر آیا جس نے ٹاٹ کا کرتہ اور ٹاٹ کی ٹوپی بہن رکھی تھی، ساتھیوں میں سے ایک نے تفریح طبع کے طور پر کہا یہ ٹاٹ کتنے میں خریدا ہے، فقیر نے جواب دیا: دنیا دے کر خریدا ہے۔ اور بیچنے والے نے مجھ سے کہا اسے پھر میرے پاس بیچ دو۔ اور

آخرت لے لو گریں نے نہیں سجا۔ تلہ

ملاحظہ فرمائیں ٹاٹ کے کرے اور ٹوپی کی قیمت! ع

نرخ بالا کن کہ ارزانی سنوز

دنیا اگر فقیر خدامت کے قدموں میں ہوتی ہے تو پیش نظر آخرت بھی نہیں ہوتی بلکہ اسے پس پشت رکھا جاتا ہے ان کی نگاہ تو صرف مالک دنیا و مالک یوم الدین پر پڑتی

۶

امام ابو بکر اسحاق کلاباؤمی لکھتے ہیں:-

شیخ ابوالحسن دراجؒ نے سرمہ دانی کی تلاش میں اپنے استاد کے برتن کو ٹٹولا تو اس میں چاندی کا ایک ٹکڑا پایا، فرماتے ہیں۔ مجھے اس پر سخت حیرت

ہوئی، جب استاد آئے تو میں نے عرض کیا، آپ کے برتن میں مجھے چاندی کا ایک ٹکڑا ملا ہے، انہوں نے فرمایا تم نے دیکھ لیا ہے، اسے وہیں رکھ دو، پھر کہا اسے تم لے لو اور اس سے کچھ خرید لو، اس پر میں نے کہا۔ آپ کو اپنے مہبود کی قسم! اس ٹکڑے کا کیا تقصہ ہے؟ فرمایا اللہ نے اس کے سوا کوئی اور سونے اور چاندی کا ٹکڑا نہیں دیا تو میں نے چاہا میں وصیت کروں کہ اسے میرے کفن کے ساتھ باندھ دیا جائے تاکہ میں اسے اللہ کو واپس کروں۔ ۱۰

یہ رہی ان کی غیرت فقر!

یہ لوگ اپنی شان و آن فقر کی کس قدر حفاظت کرتے تھے، اور انہوں نے کس طرح فقر کو اپنا اور ہٹنا بھوتا بنایا تھا اور ان کا قال و حال کیوں کر فقر کا نمونہ تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

شیخ ابو محمد حلیمؒ فرماتے ہیں میں نے شیخ احمد بن محمد الجلاءؒ سے فقر کے متعلق سوال کیا۔ آپ خاموش رہے لوگ اٹھ کر چلے گئے، پھر آپ اپنی جگہ پر جا کر تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور فرمایا، میرے پاس چار دانگ (پارہم) تھے اس لیے مجھے اللہ سے شرم آئی کہ میں فقر کی بات کروں۔

فقر کے بارہ میں مندرجہ صدر تشریحات و توضیحات کے بعد ان میں کوئی ایسی چیز ہے جسے ہدفِ طعن بنایا جاسکے بلکہ یہ صفات اگر پوری امت اپنالے تو اس کے لیے دوبارہ اپنا کھوپڑا مقام و وقار بحال کرنے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی یہی وہ فقر ہے جو تصوف کی تعلیمات میں نیلوی اہمیت کا حامل اور صوفیاء کا طرہ امتیاز و امتداد ہے۔

## توبہ

جب ہم تصوف کی مستند اور اہمات کتب کا مطالعہ کرتے اور صوفیاء کرام کی مجالس و محافل کے بارے میں پڑھتے ہیں، تو وہاں 'توبہ' کی تلقین و تعلیم کا بکثرت ذکر ملتا ہے، بلکہ صوفیاء کرام کے ہاں خصوصی تقرب حاصل کرنے کا طریقہ ہی یہ تھا کہ انسان تمام الاثنوں سے معافی، تمام لغزشوں سے معزا، تمام فرودگذاشتوں سے مبترا اور تمام گناہوں سے تائب ہو کر ان کی خدمت میں پہنچے، توبہ کا صوفیاء کے ہاں کیا مقام و مرتبہ ہے اور کتنی اہمیت و فضیلت ہے، اس کا اندازہ شیخ عبداللہ انصاریؒ کی تحریر کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

توبہ راستے کا نشان، باریابی کی راہ نما، خزانے کی کلید، دھال محبوب کی شفیع، عظیم وسیلہ، قبولیت کی شرط اور تمام مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے توبہ کے بارے میں جو خاکہ ابھرتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ انسان، جہالت و نادانی کی بنیاد پر گناہ کر بیٹھے، پھر اسے اپنے گناہ کا شدید احساس ہو، بعد ازاں وہ فوراً اس کی تلافی کر دے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

انما التوبۃ علی اللہ للذین یعملون السوء بجهالة ثم یتوبون  
من قریب فادلک یتوب اللہ علیہم وکان اللہ علیہم حکماً۔

توبہ جن کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو  
 جہالت سے کوئی گناہ کر بیٹھے ہیں، پھر فی الفور توبہ کر لیتے ہیں سو ایسوں  
 کی خدا تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ عظیم حکیم ہے۔  
 اس سے اگلی آیت میں گناہ پر اصرار کرنے اور اسی حالت میں مر جانے والوں  
 کی توبہ قبول نہ کرنے کا ذکر ہے، گویا توبہ کے تین عناصر ترکیبی ہیں۔ احساس و اعتراف  
 جرم، تلافیِ مافات اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم بالجزم، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک  
 اور مقام پر تصریح کے ساتھ آیا ہے:-

ثُمَّ ان رُبَّكَ لَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ

ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوا، اِنَّ رَبَّكَ هُوَ بَعْدَ لَنْفُوْرٍ رَّحِيْمٌ۔

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لیے جنہوں نے جہالت سے بُرا کام  
 کیا، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور (آئندہ کے لیے) اپنے اعمال و ریت  
 کر لیے تو آپ کا رب اس کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت  
 کرنے والا ہے، تفسیر

ان دونوں آیات کو بیک وقت سامنے رکھ کر یا ملا کر پڑھنے سے توبہ کا مکمل  
 اور حقیقی مفہوم سامنے آتا ہے، توبہ کے بارے میں امام غزالیؒ نے اپنی شہرہ آفاق  
 اور قابلِ فخر کتابِ کیمیائے سعادت اور منہاج العابدین میں مفصل بحث کی ہے جس  
 میں کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا، تفصیل کے طالب ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں۔  
 احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی توبہ کی فضیلت اور تائب کی عظمت پر  
 خاصہ زور دیا گیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ایک ہی حدیث اپنے مدعا کو واضح کرنے  
 کے لیے کافی ہے۔

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے توبہ کرنے سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے اگر تم میں سے کسی کی لوق و دوق صحرا میں سواری گم ہو جائے جس پر اس کا کھانا پینا ہو اور وہ اس سے ناامید ہو جائے اور وہ ایک درخت کے سائے کے نیچے ناامید ہو کر موت کے انتظار میں سو رہا تو اس نے اچانک اپنی سواری کو دیکھا کہ اس کے نزدیک کھڑی ہے، اس کی ہمارے پورا کر خوشی سے کہنے لگا یا الہی تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں خوشی کی وجہ سے (آدابِ مراتب) بھول گیا۔ ۱۴

قرآن مجید اور حدیث سے توبہ کی فضیلت اس کے طریقہ اور قبولیت کی شرائط کا بخوبی پتہ چل گیا، اب اس ضمن میں اہل تصوف کی آراء دیکھنی چاہئیں، کہ وہ توبہ کا کیا مفہوم لیتے ہیں؟ اور ان کے ہاں توبہ کا مرتبہ کیا ہے؟ قرآن مجید کی دو مندرجہ صدر آیات میں سے جو توبہ کا مفہوم نکلتا ہے اسے ذہن میں رکھیے اور شیخ عبداللہ انصاری کی رائے ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے کس عمدگی سے قرآن مجید کے مفہوم کی ترجمانی کی ہے لکھتے ہیں:-

”توبہ کے تین ارکان ہیں، دل میں نادم ہونا، زبان پر معذرت کا اظہار بدی اور بدوں سے انقطاع“۔ ۱۵

توبہ کیا ہے؟ شیخ جنید بن محمد فرماتے ہیں:-

”گناہ کا بھول جانا توبہ ہے“۔ ۱۶

شیخ ابوبکر بن ابواسحاق کلاباذی شیخ جنید کے قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”جنید کے قول کے معنی یہ ہیں کہ تو اس فعل کی لذت کو اپنے دل سے

اس طرح نکال دے کہ تمہارے باطن پر اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔

توبہ کیوں کی جائے اور کیوں ضروری ہے؟ صوفیاء کے ہاں اس کی مختلف

وجوہات ہیں، خدا کا خوف، خدا سے حیا، ثواب کا طمع، خدا کی قربت کا احساس  
 حکم کی پابندی وغیرہم، لیکن آراء و افکار کے اختلاف کے باوجود روح سب کی ایک  
 ہے، شیخ معاذیؒ سے جب توبہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: "توبۃ الانابہ" کے  
 بارے میں پوچھ رہے ہو یا "توبۃ الاستجابہ" کے متعلق رسائل نے کہا "توبۃ الانابہ" کیا ہے  
 فرمایا تجھے اللہ کا ڈر اس لیے رہے کہ وہ تم پر قادر ہے، رسائل نے کہا پھر توبۃ الاستجابہ  
 کیا ہے؟ فرمایا تو اللہ سے اس لیے حیا کرتا رہے کہ وہ تیرے قریب ہے۔" ۱۰  
 شیخ ابو علی دقاقؒ نے توبہ کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

"توبہ، انابہ، اوبہ، جو سزا کے خوف سے کی جائے وہ توبہ ہے،  
 جو ثواب کی خاطر کی جائے وہ انابہ ہے اور جو حکم کی پابندی کو ملحوظ رکھ  
 کر کی جائے وہ اوبہ ہے۔" ۱۱

امام غزالیؒ نے توبہ کی جامع مگر مختصر اور دلنشین تعریف کی ہے لکھتے ہیں:-  
 "دل کا گناہ سے پاک ہو جانا توبہ ہے۔" ۱۲

توبہ کرنے سے پہلے اور توبہ کرنے کے بعد کی حالت میں کیا نمایاں فرق ہونا چاہیے  
 اس کی تشریح بڑے خوبصورت پیرائے میں شیخ ابراہیم دقاقؒ نے فرمائی ہے  
 شیخ ابوبکر بن ابواسحاق کلاباؤمیؒ آپ کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

"توبہ یہ ہے کہ جس طرح تو پہلے اللہ کی طرف پشت کیے ہوئے  
 تھا اور ادھر توجہ نہیں دیتا تھا اب تو ہمہ تن توجہ بن جائے اور اس کی  
 طرف پشت نہ کرے۔" ۱۳

ہم پہلے شیخ عبداللہ انصاریؒ کے حوالے سے لکھ آئے ہیں کہ توبہ تمام  
 مسرتوں کا سرچشمہ ہے یہ کیسے ہے اور کیوں ہے؟ اس کا پتہ لگانے کے لیے  
 توبہ سے پہلے کی کیفیت معلوم کی جائے تاکہ مسرتوں کے سرچشمہ کی حقیقت واضح



ہو سکے۔ شیخ ذوالنون مصریؒ توبہ سے پہلے کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچے ہیں۔  
 زمین باوجود اپنی فراخی کے تمہارے لیے اس قدر تنگ محسوس ہو کہ  
 تمہیں چین نہ آئے بلکہ تمہارا نفس تمہارے لیے تنگ ہو جائے۔ ”اللفظ  
 شیخ بو شیحیؒ نے جنید بن محمدؒ کی توبہ کی تعریف کے بارے میں تائید کی ہے اور  
 دونوں بزرگوں کا نقطہ نظر ایک ہے، یعنی گناہ کا بھول جانا اور اس کی لذت کا اثر  
 زائل ہو جانا، بو شیحیؒ فرماتے ہیں:-

”جب تو گناہ کا ذکر کرے اور تجھے اس کے ذکر سے اس کی مٹھاس محسوس  
 نہ ہو تو یہی توبہ ہے۔“

شیخ ابو حفصؒ سے دریافت کیا گیا توبہ کرنے والا دنیا سے بغض کیوں رکھتا ہے؟  
 فرمایا اس لیے کہ دنیا وہ گھر ہے جہاں اس نے گناہ کیا ہے، سائل نے پھر پوچھا، دنیا  
 وہ گھر بھی تو ہے جہاں اسے توبہ کا موقع ملا، تو فرمایا اسے اپنے گناہ کا تو قطعاً علم ہے مگر  
 قبول توبہ کے متعلق اسے کھٹکا ہے۔

یہ ہیں وہ اقوالِ صوفیاء جو ہمیں تصوف کی معتبر اور مستند کتابوں میں ملتے ہیں جن  
 میں توبہ کی فضیلت، توبہ کے محرکات، قبولیت کی شرائط، تائب کی توبہ سے پہلے اور بعد  
 کی کیفیات کا ذکر ہے، انہیں پر طبع کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ صوفیاء کی تلقین و تبلیغ قرآن  
 و سنت سے مختلف ہے؛ بلکہ جو باتیں اصول و قواعد کے طور پر قرآن و حدیث میں بیان  
 ہوئی ہیں، اہل تصوف نے ان میں مزید کشمکش اور تاثیر پیدا کر دی ہے، ان کے حسن  
 بیان اور اچھوتے انداز تعبیر نے ان باتوں کو عام ذہن کے قریب اور دل کو ان سے  
 مانوس کر دیا ہے، اب اگلے صفحات میں ہم ”تعمومی“ پر گفتگو کریں گے۔

# تقویٰ

تقویٰ قرآن و سنت کی ایک جامع اصطلاح ہے اور اس کے سلبی اور ایجابی دو پہلو ہیں، نافرمانی سے بچنا اور احکام خداوندی کی حفاظت و رعایت کرنا، اسلام میں از اول تا آخر جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہی تقویٰ ہے، حصول ہدایت قبولیت اعمال، معیت خداوندی، محبوبیت کاملہ، دنیوی و اخروی فلاح، سب تقویٰ پر منحصر ہیں، اسلام کے تمام ارکان و شعائر میں اسی تقویٰ کی جلوہ آرائی اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسی کی کار فرمائی ہے، روزہ کی غایت روح تقویٰ کی بیداری ہے۔ قربانی کا اصل مقصد تقویٰ ہے، مسجد کی عمارت میں تقویٰ بطور بنیاد شامل ہے، حج اور شعائر اللہ کے احترام میں تقویٰ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اسلام

۱۔ (یہ قرآن) تقویٰ والوں کو راہ دکھاتا ہے (البقرہ: ۲) اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے (المائدہ: ۲۷) اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے (البقرہ: ۱۹۴) اللہ تو اللہ بے شک اہل تقویٰ سے محبت کرتا ہے (التوبہ: ۴) بلاشبہ تقویٰ والوں کے لیے کامیابی ہے (بنائ: ۳۱) تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر تاکہ تم متقی بن جاؤ (البقرہ: ۱۸۳) اللہ خدا کے پاس قربانی کا گوشت اذخون نہیں پہنچا لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچاتا ہے (الحج: ۳۷) اللہ بے شک وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم ہے (التوبہ: ۱۰۸) اللہ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے (الحج: ۳۲)

کا نظام اخلاق تقویٰ سے عبادت اور اسلام کا نظام عدل تقویٰ پر مشتمل ہے معاشرے میں باہمی تعاون کی اساس تقویٰ ہی کو قرار دیا گیا ہے، نظام تعزیرات کی غرض تقویٰ ہے، تقویٰ فی الحقیقت حدود کے اندر رہنے اور ان کی حدود لانا پابندی اور رعایت کا نام ہے، یہ تقویٰ جہاں ہیں عالم انفس میں نظر آتا ہے، وہاں عالم آفاق میں بھی محسوس ہوتا ہے، دریاہوں یا سرسبز و شاداب گل بوٹے، ہر کہیں تقویٰ کا نظارہ کیا جاسکتا ہے جانوروں تک میں اس کے اثرات ہیں، شیر کا گھاس اور بکری کا گوشت نہ کھانا یہ فطرت کی حدود میں پابند رہنا (تقویٰ) ہے، کھاری اور میٹھے سمندروں کا ٹکرا کر باہم نہ ملنا بھی وہی حدود کی رعایت موجود ہے، سورج کا چاند کو نہ جا ملنا اور پانی کا نشیب کی طرف ہمیشہ بہنا تقویٰ کی عید اور عملی تفسیر ہے، انبیاء کرام کی تعلیمات میں تقویٰ سر نہرست نظر آتا ہے، نیز اللہ کے نزدیک کسی کا عزیز و کریم ہونا اسی تقویٰ کے باعث ہے، تقویٰ تین چیزوں کو جنم دیتا ہے، خدا کی موجودگی کا احساس، خدا کے حضور حاضر ہونے کا خوف اور رب تعالیٰ کے غضبناک ہونے کا ڈر، یہ تین چیزیں انسانی سیرت کا لازمہ بن جائیں تو اندرونی و بیرونی دشمن یعنی نفس امارہ اور شیطان لعین پر آسانی کا پو پایا جاسکتا ہے۔ تقویٰ کی ساری بحث کالباب اور خلاصہ یہی ہے کہ حدود شرعیہ کی پابندی پورے اخلاص اور صدق دلی کے ساتھ کی جائے، قرآن مجید نے ایک مقام پر واضح انداز میں حدود کی پابندی کو تقویٰ کہا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

تَعَادَلُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَادَلُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

۱۷۱ اور تمہارا معاد کر دینا تقویٰ کے قریب ہے (البقرہ: ۱۷۷) ۱۷۲ انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے (المائدہ: ۸) ۱۷۳ تعاون کر دینا اور تقویٰ کی بنیاد پر (المائدہ: ۲) ۱۷۴ تمہارے لیے بدلہ میں زندگی ہے اے عقل والو! کہ تم تقویٰ شعار بن جاؤ (البقرہ: ۱۷۹)

دتم نیکی اور تقویٰ کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تعاون کرنا کہ گناہ اور سرکشی پر  
یہاں تقویٰ کو عدوان کے مقابلہ میں لایا گیا ہے اور عدوان کا مفہوم حد سے تجاوز  
کرنا ہے، یعنی حد سے نکل جانا عدوان اور حد کے اندر رہنا تقویٰ ہے، بنا و بریں فیخ ابو  
عثمان مغربی فرماتے ہیں،

”تقویٰ ایسی ہے کہ بندہ حد و حد کے اندر رہے نہ کوتاہی کرے نہ تجاوز کرے“  
تقویٰ کے بارہ میں اس عام تاثر کی کوئی دلیل قرآن و سنت میں نہیں ملتی جو معاشر  
میں رائج اور قائم ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ہر وہ شخص  
ستقی ہے جو اپنی زندگی کے ہر گوشے میں فرائض و واجبات اور مامورات و منہیات کا  
احترام کرے ہر اس کام کو پورے جوش و خروش سے کرے جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے  
اور ہر اس کام سے رک جائے جس سے روکا گیا ہے، تقویٰ کی بحث میں اس امر کا خیال  
بھی ضروری ہے کہ تقویٰ کا زیادہ تر تعلق کمیت سے نہیں کیفیت سے ہے، اعمال و  
اشغال کی کثرت سے تقویٰ پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ تو خالصتاً دل کا فعل ہے، دل کی یہی  
آبادگی و اخلاص معمولی عمل کو اللہ کے نزدیک غیر معمولی بنا دیتے ہیں، ایک انسان ترک  
دنیا کر کے حدود اللہ کو فراموش کرنے کا مرتکب ہو سکتا ہے اور دوسرا شخص امور دنیا  
میں مشغول و منہمک ہو کر بھی حدود اللہ کی رعایت با حسن طریق کر سکتا ہے، خلوت و  
خلوت میں اللہ کے حدود کی پابندی کا اہتمام تقویٰ ہے۔

شیخ بہاد الدین نقشبند فرماتے ہیں، میں زندگی میں دو مرتبہ سحت حیران ہوا،  
ایک شخص کو کعبہ کے طواف کے دوران خدا سے غافل پایا تو بہت حیران ہوا مگر اس  
سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی، جب بخارا کے تاجر کو کپڑا بیچتے وقت یاد خدا میں  
مصرف پایا۔

بعض لوگوں نے صرف کثرتِ نوافل اور اوراد و وظائف میں حد و درجہ دلچسپی و انہماک

کو تقویٰ کا اصلی کام قرار دے دیا ہے اور اس کے علاوہ دین کے جتنے اہم اور عظیم کام ہیں، ان سے بے رحمانہ بے رخی برتی گئی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ تقویٰ جس کا اصل مقصد توازن و اعتدال ہے، خود توازن کے دائرے سے نکل کر بے اعتدالی کی راہ پر چلا گیا، تقویٰ کی زبان میں ہم اس مسئلہ کو یوں سمجھ سکتے ہیں، بقول شیخ ابوالحسن سیروانیؒ: "صوفی اور اوستہ نہیں واردات سے ہوتا ہے۔ جس حد تک عبادات کو قرآن و سنت جائز اور مناسب قرار دیتے ہیں، ان کی ادائیگی اور حزم و احتیاط یہ روح تقویٰ ہے، ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کو بڑی خوبصورتی سے واضح فرمایا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے پاس تین جماعتیں آپ کی عبادت کا حال پوچھنے آئیں، جب ان کو آپ کی عبادت کا پورا پورا حال بتایا گیا تو کچھ ایسا ظاہر ہوا کہ ان کی نظر میں بہت کم ہے، پھر وہ بولے ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ؟ آپ کو تو اگلی اور پچھلی خطائیں نہ ہونے کے باوجود معاف کر دی گئی ہیں، پھر ان میں سے ایک شخص بولا میں ہمیشہ رات بھر عبادت کروں گا، دوسرا بولا میں ہمیشہ روز سے رکھوں گا، تیسرے نے کہا میں عورتوں سے بالکل قطع تعلق کروں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا، اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگئے، آپ نے فرمایا تم لوگ یہ یہ کہہ رہے تھے، خدا کی قسم میں تم سے کہیں زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس سے تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود روز سے بھی رکھتا ہوں، نمانہ بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں آرام بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جس نے میری طریقہ سے انحراف کیا وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔"

یہ حدیث بذاتِ خود اپنی تشریح آپ ہے، تقویٰ کے مفہوم میں جہاں یہ بات شامل ہے کہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے وہاں اس امر کا بھی اہتمام ملتا ہے کہ حتی الوسع حزم و احتیاط سے کام لیا جائے، یعنی جس مقام سے معصیت کی حد شروع ہوتی ہے عین اسی مقام کے آخری کناروں پر گھومنا آدمی کے لیے خطرناک ہے، یہی معنوں ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بادشاہ کی ایک حمی (وہ چراگاہ جسے کوئی بادشاہ رعایا کے لیے ممنوع قرار دے دیتا ہے، ہوتی ہے اور اللہ کی حمی اس کی وہ حدیں ہیں جن سے اس نے حرام و حلال اور طاعت و معصیت کا فرق قائم کیا ہے جو جانور حمی کے گرد چرتا رہے گا، ہو سکتا ہے کہ ایک روز وہ حمی کے اندر داخل ہو جائے۔

اسی حدیث کی صدائے بازگشت امیر عمر رضی اللہ عنہ کا وہ قول ہے جسے شیخ عبدالقادر جیلانی نے نقل فرمایا ہے: ہم (محل شبہ میں) حلال کی دس چیزوں میں سے نوحرام میں پہنچانے کے خوف سے چھوڑ دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے تقویٰ کے بارہ میں پوچھا گیا، آپ نے سائل سے فرمایا: اگر تم ایسی راہ سے گزر رہے ہو جس کے دائیں بائیں خاردار جھاڑیاں ہیں تو کیسے گزرو گے، جو اب دیا میں اپنے کپڑے سمیٹ لوں گا، فرمایا یہی حزم و احتیاط، تقویٰ ہے۔ اس بات کی تائید ہمیں اہل تصوف کے ہاں سے ملتی ہے، شیخ ذولنون مہریؒ سے پوچھا گیا، بندے کے لیے خوف کی راہ کب آسان ہوتی ہے؟ فرمایا جب وہ اپنے آپ کو بمنزلہ بیمار سمجھے تو وہ اس ڈر سے کہ میں بیماری طول نہ پکڑ جائے، ہر چیز سے پرہیز کرتا ہے۔

تقویٰ کی تعریف، مفہوم اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد

ہم صوفیاء کرام کے ان اقوال پر نظر ڈالتے ہیں جو ہمیں اس موضوع پر ملتے ہیں، تقویٰ میں خوف ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہے، حدود اللہ کی پابندی کے اصل محرکات کیا ہیں، اس کے دو ایجابی اور سلبی پہلو ہیں، نافرمانی کے باعث درجات میں کمی اور عذاب میں ابتلاء، اس لیے صوفیاء کرام نے اپنے پیروکاروں میں زیادہ سے زیادہ خدا کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کی، اگر یہ چیز پیدا ہو جائے تو مصیبت و عذاب سے ایک گونہ وحشت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے، بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن پر معاشرہ حد یا تعزیر نافذ کر سکتا ہے مگر بعض گناہ وہ ہیں جن پر گرفت کی صورت ممکن نہیں مثلاً حسد، بغض، کینہ، ریاء وغیرہم ان پر صرف اپنے اندر خوف خدا پیدا کر کے قابو پایا جا سکتا ہے، یہ چیز احساس و ادراک کی اصلاح سے ہوتی ہے کیونکہ احساس و ادراک پر کسی قسم کا کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کی ساری کوششوں کا محور و مرکز انسان کا احساس و ادراک رہا، وہ جانتے تھے کہ تمام نیکیوں اور برائیوں کا سوتا یہی ہے، اسی لیے اس کی درستی میں پورے جسمانی بلکہ معاشرتی نظام کی درستی مضر ہے، ایک شخص اگر گناہ کا ارادہ کرتا ہے مگر یہ خیال آتے ہی رک جاتا ہے جس کا رذق کھانا ہوں اس کی نافرمانی کتنی بڑی احسان فراموشی ہے تو بس یہی خیال تقویٰ بن جانا ہے، اگر گناہ سے اس لیے باز آ جاتا ہے کہ خدا ہر کہیں موجود ہے اس کی موجودگی میں اس کی نافرمانی کتنا بڑا اور سنگین جرم ہے، تو یہی احساس تقویٰ بن جاتا ہے، اگر گناہ سے اس لیے پہلو تہی کی کہ کوئی جگہ ایسی نہیں جو خدا کی حدود مملکت سے باہر ہو فلہذا اس کی مملکت میں اس کی نافرمانی گویا خود موت کو دعوت دینا ہے تو یہی سوچ تقویٰ بن جاتی ہے، اگر گناہ سے کنارہ کشی کا سبب یہ امر بن جاتا ہے کہ خواہ کہیں اور کسی حال میں گناہ کروں، قیامت کے دن اس کی باز پرس سے نہیں بچ سکوں گا تو بس اسی کا نام تقویٰ ہے، صوفیاء کرام کے نزدیک خدا کا خوف ہی گناہ کے مقابلے میں ڈھال کا کام

دیتا ہے، اس لیے ان کے مواعظ اور ان کی مجالس و محافل میں زیادہ تر گفتگو خوف الہی اور خشیت خداوندی کے موضوع پر ہلتی ہے، اور وہ یہ سمجھتے تھے اور تمہیں بھی سمجھنا چاہیے کہ خدا کا خوف ہی وہ تازیانہ ہے جو انسان کو ہر وقت متنبہ اور خبردار رکھتا ہے اور کبھی غفلت کے گڑھے میں نہیں گرنے دیتا، بنا بریں خواجہ حسن بھری سے پوچھا گیا "ان لوگوں کی مجلس کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے جو ڈرا ڈرا کر ہمارے دلوں کے ٹھکانے ٹوٹے کیے دیتے ہیں، ارشاد فرمایا، ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنا جو تمہیں آج ڈرا کر کل کے خوف سے نجات دلا دیں ان لوگوں کی صحبت سے بہتر ہے جو آج تمہیں بے خوفی کا درس دے کر کل دردناک خوف میں مبتلا کر دیں۔"

صوفیاء کرام کے ہاں کسی بھی مقام پر خدا سے بے خوفی کی اجازت نہیں، وہ ہر لمحے خود احتسابی کا سبق دینے میں مشغول رہتے تھے اور چونکہ رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے، ان کے ہاں کوئی شخص، کوئی مقام اور کوئی سائل ایسا نہیں جسے کر کے انسان یہ محسوس کرے کہ اب میں معصیت و نافرمانی سے بالکل محفوظ ہو گیا ہوں، بلکہ اسے ہر وقت ان دیکھے خوف میں مبتلا رہنا چاہیے، خبر نہیں کسی وقت پاؤں پھسلے اور عمر بھر کی کمائی اکارت چلی جائے، حضرت عاتق اعمم فرماتے ہیں تو کسی نیک جگہ پر دھوکا نہ کھا کیونکہ جنت سے بڑھ کر کوئی نیک جگہ نہیں ہو سکتی، پھر بھی اس میں حضرت آدم علیہ السلام پر جو گزری سو گزری نہ کثرت عبادت پر غرور کر، کیونکہ ابلیس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی اس قدر طویل عبادت کے بعد ہوا، صالحین کی صحبت و دیدار پر بھی بھروسہ نہ کر کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس کی شان ہو سکتی ہے؟ مگر آپ کے شہزادے آپ کے دیدار سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔"

خوف و تقویٰ اختیار کرنے کے ضمن میں نہ صرف شیطان پر نظر رکھنا کافی ہے کہ کہیں کوئی اوجھاوار کر کے چپت نہ گراوے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ اپنے نفس کی



نگرانی ضروری ہے جو کولر ہاتھ میں لیے بغیر لاتا ہے، خارجی دشمن سے یہ داخلی دشمن کہیں زیادہ خطرناک ہے، اندر سے پیدا ہونے والی بیماری باہر کے لگے زخم سے زیادہ تشویشناک ہوتی ہے اس لیے حضرت ابو عمر و دمشق نے متقی اور خائف کی تعریف میں فرمایا:-

خائف وہ شخص ہے جو اپنے نفس سے اپنے دشمن (شیطان) کی نسبت زیادہ خوف کھاتا ہو۔"۔

خوف و تقویٰ کی اقسام بیان کرتے ہوئے امام غزالی فرماتے ہیں:-

مشہوت سے باز رہنا عفت، حرام سے دور رہنا ورع اور مشتبہ حلال سے رکنا تقویٰ ہے۔"۔

خوف و خشیت کے بار بار تذکرہ سے یہ غلط فہمی ہرگز پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ انسان ہر وقت بیدار لگڑی کی طرح لرزتا ہے، اس کی آنکھوں کے کنارے ہمہ وقت تر رہیں، آواز میں خاص قسم کی رقت آجائے، لب و لہجہ میں سکینہ ٹپکتی محسوس ہو، وضع قطع سے کسی مستقل بیماری کا شائبہ ابھرتا ہو اور چہرہ نہرہ کسی حسرتناک مایوسی میں لپٹا لگانا دے بلکہ خوف و خشیت کا جو مفہوم قرآن و سنت میں آیا ہے، یعنی منہیات و منکرات سے پرہیز بعینہ وہی کچھ ہیں صوفیاء کرام کی تعلیمات میں ملتا ہے اس کو امام ابو القاسم قشیری فرماتے ہیں:-

"خائف اُسے نہیں کہتے جو رو رہا ہو اور اپنی آنکھیں پونچھتا ہو، بلکہ خائف تو اُسے کہیں گے جو اس چیز کو جس پر اسے عذاب کا ڈر ہے ترک کر دے۔"۔

اب ہم آخر میں چند لیے ایمان افزہ اور رقت انگیز واقعات نقل کریں گے جن سے پتہ چلتا ہے کہ خوفِ خدا رکھنے والے لوگ کس طرح اپنے نفس کا محاسبہ جاری رکھتے ہیں۔

حضرت احنف بن قیس کا کہنا ہے کہ میرے دل میں گناہ کا خیال ابھرا میں نے اپنی

انگلی جلتے ویلے پر لہ دی اور کہا نفس تو ایک چراغ کی آگ تو سہ نہیں سکتا۔ جہنم کی آگ کو کیسے برداشت کرے گا اور اس طرح میرے دہسج سے گناہ کا خیال یکدم محو ہو گیا، انہی کا واقعہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا خیال آیا اپنی عمر کا اندازہ لگایا تو ساٹھ برس نکلی اور اکیس ہزار پانچ دن بنے، اور — ایک دن میں ایک گناہ کا صدور فرض کر لیا جو آپ کے خیال میں کم سے کم تھایوں اکیس ہزار اور پانچ گناہ سرزد ہوئے، یہ سوچنا تھا کہ غش کھا کر گرے اور بے ہوش ہو گئے نہ۔

شیخ جنید بغدادیؒ کے حقیقی ماموں اور مرشد طریقت شیخ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

میں روزانہ اپنے چہرے پر نظر ڈال کر دیکھتا ہوں کہ کہیں مدسیاہ تو نہیں ہو گیا ہوں۔

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی روایت کے مطابق شیخ سری سقطیؒ نے متعدد بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بغداد کے علاوہ کسی اور شہر میں مرنا چاہتا ہوں، پوچھا گیا، کیوں فرمایا مجھے ڈر ہے کہیں میری قبر مجھے قبول نہ کرے تو روانہ ہو جاؤں۔

سچ ہے خدا کا خوف ہو تو کوئی پل غفلت میں نہیں گذر سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر دل میں خوف خدا ہو تو بڑے سے بڑے حملہ آور کو اس قلعہ میں محفوظ رکھنا کام ٹرایا جاسکتا ہے۔ بھاری سے بھاری ہتھیار کو اس ڈھال پر گند کیا جاسکتا ہے اور مہلک سے مہلک زہر کے لیے اس سے تریاق کا کام لیا جاسکتا ہے جیسا کہ شیخ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں،

خوف الہی ایمان کا قلعہ، ہوا و ہوس کے لیے تریاق اور مومن کا ہتھیار ہے۔

# اخلاص

اسلام میں تمام اعمال کا دار و مدار اخلاص پر ہے، وہ عمل، عمل نہیں جس میں اخلاص نہ ہو، زندگی بھر کی عبادت اس وقت اکارت ہو جاتی ہے جب اس میں اخلاص نہ ہے انسانوں کے تعلقات بھی اگر اخلاص پر استوار ہوں تو پائیدار رہتے ہیں تو آخر بندے کا خدا کے ساتھ تعلق اخلاص کے بغیر کیسے قائم رہ سکتا ہے، انبیاء کرام نے آغاز کار ہی میں واضح کر دیا مَا اسْتَدْعُو عَلِيهِ اجْرًا اِنْ اجْرِي اِلَّا عَلَى اللّٰهِ مِنْ تَمَمِّ سِ كُوْنِي حَقِّ الْخِدْمَتِ نَهِيں لَوْنِ كَا مِيْرَا جُو تُو اَللّٰهُ تَعَالٰى كَيْ هَا مَحْفُوْظْ هَيْ، قرآن مجید یا کارانہ عمل کو منافقین کا فعل قرار دیتا ہے، کوئی شخص اگر دکھلاوے کو مال خرچ کرے تو وہ کسی اجر و ثواب کا مستحق نہیں ہوتا۔ قرآن مجید اس کے اس عبارت فعل کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے،

ترجمہ: جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر، اس کے خرچ کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔

حدیث میں وارد ہے، جو شخص دکھانے کو نماز پڑھے مشرک ہے۔ جو شخص دکھانے کا روزہ رکھے وہ مشرک کا مرتکب ٹھہرتا ہے اور جس

نے لوگوں کو دکھانے کے لیے صدقہ و یا وہ بھی مشرک ہے۔ ۱۸۶

الغرض دین خلوص اور اخلاص کا دوسرا نام ہے، جس میں اخلاص نہیں اس میں دین نہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہو یا صدقہ، جہاد ان سب کی بنیاد اخلاص نہیں تو کچھ بھی نہیں، شیطان کے کارگرداؤں میں سرفہرست یہی داؤ ہے کہ انسان کو رحمان کے معاملے میں اخلاص سے محروم کر دے اور نتیجے کے طور پر نماز محض ڈیوٹی بن کر رہ جائے، روزہ بغیر بھوک پیاس برداشت کرنے کے کلیتہً بے ثمر رہے، زکوٰۃ صرف تاوان ہی سمجھی جائے اور حج سفر اور سفر کی کلفتوں کا مجموعہ بن جائے، جہاد و لوجباعت دینے کا ذریعہ اور صدقہ شہرت کا وسیلہ،

تجربہ شاہد ہے کہ وہ بوٹا آگ ہی نہیں سکتا جسے پانی نہ ملے بعینہ وہ عبادت نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جس کی بنیاد اخلاص نہ ہو، حضرت علیؓ فرماتے ہیں، **مَا لِيْ عِبَادَتِكَ مِنْ حَقِّكَ وَلَا طَمَعًا فِيْ جَنَّتِكَ وَلَكِنْ رَجَدْتُكَ اِهْلًا لِّعِبَادَةِ نَعْبِدُكَ**

یا الٰہی میں جہنم کے ڈر یا جنت کے طمع میں تیری عبادت نہیں کرتا بلکہ تو عبادت کا مستحق ہے اس لیے تیری عبادت کرتا ہوں۔ یہ ہے اخلاص کی عمدہ مثال۔ صوفیاء کرام نے بھی ہمیشہ اسی اخلاص کو لوگوں میں عام کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے جب اپنے کام کا آغاز کیا تو یہ نہ تھا کہ نماز پڑھنے والے اور روزہ رکھنے والے لوگ نہ تھے، سب کچھ تھا لیکن محض عرفاً اور رسماً، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔

**كُنْ مَعَ اللّٰهِ صَحَابًا لَا خَلْقَ وَكُنْ مَعَ الْخَلْقِ كَأَنَّكَ لَا نَفْسَ**  
خدا کے ساتھ بغیر مخلوق اور مخلوق کے ساتھ بغیر نفس کے معاملہ کر۔

یعنی عبادت مخلوق کی خوشنودی کے بغیر مہوں اور معاملات نفس کی خواہش کے علی الرغم، اخلاص پر مبنی ہوں۔

شیخ عبداللہ انصاریؒ الرومیؒ اخلاص کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اخلاص کی تین قسمیں ہیں، اخلاص شہادت وہ اسلام میں ہے، اخلاص خدمت وہ ایمان میں ہے، اخلاص معرفت وہ حقیقت میں ہے اخلاص شہادت کے تین گواہ ہیں، اللہ کی عبادت میں مخلوق کو نہ دیکھنا یعنی ریاسے پیمبر کا رحق میں سنت مطہرہ کی پاسداری اور اطاعت الہی میں حلاوت پانا، اور اخلاص معرفت کے بھی تین گواہ ہیں، وہ خوف جو گناہ سے دکنے والا ہو، وہ امید جو طاعت پر ثابت قدم رکھے وہ محبت جو حکم الہی کے ساتھ موافقت رکھنے والی ہو۔

علم پر نازاں اور زہدان خشک ہمیشہ خود بینی کے مرض میں مبتلا رہے ہیں، مگر صوفیاء کرام نے اپنے دائرہ اثر میں خود شکنی کو رواج دیا کیوں کہ اخلاص کا یہی تقاضہ ہے۔

ابو محمد رویم البنادی فرماتے ہیں :-

”اخلاص یہ ہے کہ تو اپنے عمل کو دیکھنا چھوڑ دے۔“

انسانیت کے ماتھے پر بدترین داغ یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن میں مطابقت نہ ہو، زبان پر ”عشق“ کا دعویٰ مگر دل میں ”فسق“ بھرا ہوا ہو۔ ماتھے پر بظاہر عبادت کے باعث سیاہ رنگ کا محراب ہو لیکن دل پر اس سے بھی زیادہ سیاہ نقطہ ہو، انسان کی جلوت رحمانی مگر خلوت شیطانی ہو، دیکھنے میں انسان اور پرکھنے پر حیوان ثابت ہو، دن خشک گزریں اور راتیں تر، بسریوں، اسی بے آہنگی اور عدم مطابقت کو صوفیاء نے ہم آہنگی اور یکسانیت میں بدلنے کی کوشش کی، حدیفہ مرعشی فرماتے ہیں۔

”اخلاص یہ ہے کہ بندے کے ظاہر و باطن میں یکسانیت ہو۔“

ذوالنون مصریٰ اخلاص کی علامات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اخلاص کی تین نشانیاں ہیں، عوام کی مدح یا مذمت بندے کے نزدیک  
یکساں ہو، اعمال میں اپنے اعمال کو دیکھنا بھول جائے، آخرت میں اپنے  
صلہ کا بے قراری سے منتظر نہ ہو، ۱۰

اخلاص عمل کے ضمن میں عمدہ ترین تشریح شیخ ابو یعقوب سوسی نے کی ہے۔  
فرماتے ہیں:-

”خالص عمل وہ ہے جس کا فرشتوں تک کو پتہ نہ ہو، کہ لکھ سکیں اور نہ  
شیطان کو خبر ہو کہ لگاڑ سکے اور نہ ہی نفس کو علم ہو کہ اس پر فخر کر سکے۔ ۱۱  
کسی بھی کام کو محض خوشنودی رب اور رضاے الہی کے لیے کرنا اگرچہ کمٹن  
ہے لیکن اخلاص کا مرتبہ یونہی نہیں مل جاتا، اس کے لیے بہر کیفیت نفس اور خواہشات  
نفس کو قربان کرنا پڑتا ہے، اس امر کا ہر ایک کو احساس ہے کہ جب نفس کو لذات و  
خلوط سے محروم رکھا جاتا ہے تو وہ زخمی و زردے کی طرح پلٹ پلٹ کر حملے کرتا ہے  
غراتا اور جھپٹتا ہے، مگر منزلِ اخلاص پانے کے لیے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے، نفس کے  
لیے ہر وہ عمل گراں ہوتا ہے، جس کا محرک اخلاص ہو ایسا کیوں ہوتا ہے، سہل بن  
عبداللہ تہسرتی فرماتے ہیں:-

”در یافت کیا گیا نفس پر کونسی چیز گراں ہے، فرمایا اخلاص! کیوں کہ  
اس میں نفس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ۱۲

اب ہم آئیں علی بن الموفقؒ المتوفی ۲۶۵ھ کی مناجات کا ایک حصہ  
یہاں پیش کرتے ہیں جس سے یہ سمجھے میں آسانی ہو جائے گی کہ ارباب تصوف اپنے  
ہر عمل کو خالص کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتے تھے بلکہ یوں کہیں کہ کوئی عمل خدا  
کے حضور پیش بھی کیا جاسکتا ہے جو کھوٹا اور آلودہ ہو، رب العزت کے حضور عرض  
پرواز ہیں۔

میرے مولا! اگر تو یہ جانتا ہے کہ میں تیری عبادت تیری بنائی ہوئی جہنم کے خوف سے کرتا ہوں تو تو مجھے اس کا ایندھن بنا دے، اگر تو جانتا ہے کہ میں تیری عبادت جنت کے طمع میں کرتا ہوں تو تو مجھے اس سے یکسر محروم کر دے اور اگر تو جانتا ہے کہ میری عبادت صرف تیرے شوق دیدار میں ہے تو پھر تیرا جو جی چاہے میرے ساتھ سلوک کر۔ یہ اخلاص کی معراج اور نقطہ کمال کی بہترین مثال ہے جو اس مناجات سے ہلکے سامنے آتی ہے، گویا ان کے نزدیک شوق جنت اور خوف جہنم بھی ایک آلائش ہے جس سے عمل کو آلودہ نہ ہونے دیا جائے، ان کی نظر میں طمع دنیا کا ہو یا آخرت کا بہر حال طمع ہی ہے اور طمع ہوتے ہوئے اخلاص امر محال ہے۔

<http://t.me/Tehqiqat>

# صبر

صبر بہت سے اہم ترین اخلاقی اوصاف کے لیے ایک جامع عنوان کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقت میں یہ وہ ”شکلید“ ہے جس سے مصیبت کا ہر قفل کھل جاتا ہے یہ وہ نیا رہ نورا ہے جہاں سے منزل صاف طور پر دکھائی دینے لگتی ہے یہ وہ مشعل ہے جسے ہاتھ میں تھام کر راہ کے ہر روڑے، ٹھوکر اور کھائی سے بچا سکتا ہے، صبر کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتا، نیکی کے راستے پر چلنے میں اگر کوئی دشواری محسوس ہو رہی ہو تو قرآن مجید اس دشواری کا علاج ”صبر“ بتاتا ہے: ”وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ“

صبر دراصل روکنے اور باندھنے کو کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی سختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب و ضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر بے ستور بڑھتا چلا جائے، اگر راہِ حق کا راہی انسان صبر کو اپنا زاویرا بنا کر چل دے تو وہ کسی نقصان یا مصیبت سے ہمت نہیں ہارتا، کسی ناکامی سے دل شکستہ نہیں ہوتا، کسی لالچ سے پھسل نہیں جاتا اور کسی بھی حالت میں راستی اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، قرآن مجید میں بار بار صبر اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے کبھی طاعت پر، کبھی بیماری اور تکلیف میں، کبھی راہِ حق میں اور کبھی دشمن کے مقابلے پر، العرض جہاں بھی ڈولنے یا پھسلنے کا خطرہ ہو وہاں صبر ہی قدم میں ثبات



یا کرتا ہے۔

آزمائش کے مراحل کے لیے اس کی ضرورت قرآن مجید نے یوں بیان کی ہے۔  
 ”مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی اور تم  
 اپنی کتاب اور مشرکین سے بہت تکلیف دہ باتیں سنو گے اگر ان سب  
 حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے وصلے کا کام

ہے۔“ (آل عمران، ۱۸۶)

تنگی مصیبت اور جنگ کے وقت قرآن مجید صبر کا حکم دیتا ہے۔

”اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ

میں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔“

حق و باطل کی کشمکش کے دوران صبر کی اہمیت قرآن مجید کی روشنی میں،

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ

نے یہ نہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں

رٹانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔“

دشمنوں کے شر سے بچاؤ کے لیے قرآن مجید کون سا کارگر سمجھنا فراموش کرتا ہے

ملاحظہ ہو۔

”اگر تم صبر اور خدا ترسی اختیار کرو تو تمہارے دشمنوں کی کوئی تدبیر تمہارے

خلاف کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

قرآن مجید کے بعد احادیث بھی صبر کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتی ہیں

۔ سیوں مقامات ایسے ہیں، جہاں صبر کے فضائل، خوشگوار نتائج اور بہترین ثمرات

کا ذکر ملتا ہے۔

قرآن مجید کی تصریحات کے علاوہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابہ کی سیرتیں

صبر و استقامت کا مرقع تھیں اور صبران کی کتاب زندگی کا عنوان اول تھا۔ صوفیاء کرام نے بھی اپنی تعلیمات میں صبر کو نمایاں جگہ دی ہے، یوں کہا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا کہ صوفیاء کرام کی زندگی میں جو توکل، استقلال، ایثار، جفاکشی، سادگی اور مداومتِ عمل کی کیفیات پائی جاتی ہیں، یہ صبر کی نعمت صورتیں ہیں، کیونکہ تمام امور بخوشی اللہ کے سپرد کر دینا کمال درجے کا صبر ہی تو ہے، دنیوی موانع اور نفسانی مزاحمتوں کے مقابلے میں مستقل مزاجی صبر ہی ہے، تعیش اور تنعم کی زندگی کو خیر باد کہہ کر جفاکشی کی راہ اپنانا بھی صبر ہے، دنیا کی زیب و زینت سے صرف نظر کرتے ہوئے سادگی کی روش اختیار کرنا صبر نہیں تو کیا ہے؛ اپنا سب کچھ دوسروں کے لیے وقف کر دینا صبر ہی کی ایک شکل ہے، ماحول کی ناسازی اور شیطان کی وسوسہ اندازی کے علی الرغم اپنا کام کیے جانا صبر کی عمدہ مثال ہے، غرض صبر کو صوفیاء نے اپنا اور طہنا بھونا بنالیا تھا، تصوف کے لٹریچر میں صبر کے سلسلے میں متعدد باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں مگر ان سب کی روح اور غایت ایک ہی ہے، شیخ عبداللہ انصاری صبر کے تین ارکان بتاتے ہیں۔

”مصیبت پر صبر کرنا کما قال اللہ، اصبر و اصمیت پر صبر کرنا یعنی رک جانا، کما قال اللہ صابر و اطاعت پر صبر کرنا کما قال اللہ، رابطو، ۵  
امام ابو بکر محمد بن اسحاق کلابادی صبر کے متعلق رقمطراز ہیں۔

”صبر یہ ہے کہ تو صبر کے اندر بھی صبر کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تو صبر کرتے ہوئے بار بار یہ نہ دیکھے کہ بلا کب طمّتی ہے اور کب کشائش ہوتی ہے؟  
حضرت جنید بغدادیؒ سے استفسار کیا گیا کہ صبر کے کتنے ہیں؟ فرمایا۔  
”تاک بھوں چڑھائے بنیر کرادی چیز کا گھونٹ پی جانا صبر ہے“  
امام ابوالقاسم القشیریؒ حضرت ابراہیم خواصؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

کتاب و سنت کے احکام پر ثابت قدم رہنا صبر ہے۔<sup>۱۷</sup>  
 صبر کا بالعموم یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ انسان صرف تنگی اور مصیبت کے وقت  
 جزع و فزع نہ کرے، لیکن صوفیاء کی تعریحات سے جس طرح معلوم ہوا ہے وہ اسے  
 ایک وسیع معنی اور مفہوم میں لیتے ہیں۔ شیخ محمد حسن مجددی فاروقی فرماتے ہیں۔  
 صبر دو قسم ہے، ایک ان میں دوسرے سے افضل ہے، ایک مصیبتوں  
 میں صبر کرنا ہے، یہ بھی اچھا ہے لیکن اس سے افضل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ  
 کی کل حرام کی ہوئی چیزوں سے کیا جائے۔<sup>۱۸</sup>

صوفیاء کرام کی ان تعلیمات کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے اندر ضبط نفس، حدود  
 کی رعایت، ثبات قدمی استقامت اور مستقل مزاجی کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں  
 اسلام بھی تو اپنے پیروکاروں کے اندر یہ صفات پیدا کرنا چاہتا ہے، صبر ظلم سے اور  
 چپ رہنے کا کام نہیں، طاقتور کے مقابلے میں عاجزی کو صبر نہیں کہتے، صبر سراسر  
 انضباط نفس ہے اور اسکا اظہار موقع و محل کے مطابق ہوتا رہتا ہے۔

# فتوت

یہ درحقیقت قیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے دوسروں کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

آج کے مادہ پرستانہ اور خود غرضانہ ماحول میں جس قدر اس تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے، شاید گذشتہ دور میں کبھی محسوس کی گئی ہو، آج ہوا و ہوس کا دور دورہ من و تو کا جھگڑا، منافات کا چرچا، میرا حق، میرا مال، میرا کاروبار، کا غلغلہ اور کچھ "لو اور کچھ دو" کا نعرہ ہر سو گونج رہا ہے، انسان روٹی، پیٹ، نفس، مال، زہر، دھن، دولت، مفاد، اور خواہش کا بندہ بن کر رہ گیا ہے، دل ہے کہ ان کے علاوہ کچھ سمجھتا ہی نہیں، دماغ ہے کہ بجز ان کے کچھ سوچتا ہی نہیں، زبان ہے کہ اس کے سوا بولتی ہی نہیں، کان ہیں کہ ان کے بغیر کچھ سنتی ہی نہیں، آنکھ ہے کہ ان سے ہٹ کر کچھ دیکھتی ہی نہیں اللہ قیامت سے پہلے قیامت کا سماں اور حشر سے پہلے حشر پرپاہے ایشار، قربانی، فتوت، تزج، سخاوت تو بھولی بسری باتیں ہو کر رہ گئی ہیں اب تو عدل، انصاف، مساوات، برابری، تقسیم جسی اصطلاحات بھی آثار قدیمہ بنتی چلی جا رہی ہیں ہر طرف "میں ہی میں" اور "میرا ہی میرا" کا شور برپا ہے، اس سب کچھ میرا کے فلسفے کو پروئے کار لانے کے لیے ہمسایوں کے حقوق تلف کیے جاتے ہیں، کسی بیوہ کے

سر سے دوڑتا مارا جاتا ہے، کسی تمیم کا آخری سارا پھینا جاتا ہے، ایمان و ضمیر کا سودا کیا جاتا ہے، قانون کو پامال کیا جاتا ہے، انصاف خردا جاتا ہے، انسانیت کھلی جاتی ہے، خون بہایا جاتا ہے، ہر شخص سب کچھ کیا جاتا ہے، آج اس تحفظ ذات اور مفاد خویش نے انسان کے دل سے رحم اور آنکھوں سے حیا کو ختم کر دیا ہے، رشتوں کو تقدس اور دوستی کو خلوص سے عاری کر دیا ہے۔

ظہر ہو جس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انسان کو

اسلام نے حق طلبی پر فرض شناسی کو ترجیح دی ہے، لذت کیشی پر آرام رسانی کو فوقیت دی ہے، اسلام انسان کو سوداگر، تاجر یا پیشہ ور نہیں حضرت انسان دیکھنا چاہتا ہے جس کے پہلو میں پتھر نہیں دھڑکتا دل ہو، دل میں جذبات کا سمندر موجزن ہو، آنکھوں میں مروت کی لکیریں ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی دوسرے کو آرام بہم پہنچانے میں گزری، برابر کا حق وصول کرنا کونسا کمال ہے، دوسروں کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہو جانا اصل مقام انسانیت ہے، پھول کے بدلے بھول تو رسم دنیا ہے، پتھر کے جواب میں بھول برسانا معراج آدمیت ہے، بھلا کر بھلا ہوگا تو فقیروں کی صدا ہے، مردانِ خدا سب کا بھلا مانگتے ہیں، انصارِ مدینہ کے دیگر اوصاف کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ نے ان کے ایثار و قربانی کے وصف کو سراہا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَعَلْنَا عَلَيْهِمُ الْغُلَامَ وَلَوْ كَانُوا مِنْكُمْ لَكُنَّا بِكُمْ عَلَىٰ خَصَاةٍ

(اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو انہیں اپنے سے مقدم رکھتے ہیں۔)

تقوت کا سارا دار و مدار ترک خویش پر ہے، صوفیاء لینے کے معنوم ہی سی واقف نہیں وہ تو دینے کے عادی رہے، انہیں "مخدوم" نہیں "خادم" بننے میں خوشی ہوتی تھی، انہیں حقیقی راحت دوسروں کو راحت پہنچا کر ہوتی تھی، سرمایہ دارانہ

جیسے بے رحم نظام کی ناکامی کے بعد سوشلزم اور کمیونزم جیسے بے جوڑ اور غیر فطری نظام کا مقابلہ آج اگر ہو سکتا ہے تو اسی فتوت اور ایثار کی تعلیم کو اس کی روح کے ساتھ عام کرنے سے ہو سکتا ہے، اعلیٰ اہمیتی، جوان مردی، بلند ظرفی، سیرت شعی، صیادلی، اور فراخوصلگی کا تعلق اسی فتوت اور ایثار سے ہے، آج جو پرلے درجے کی خشیت، حرص، خود غرضی، ہوس پرستی، اور تنگدلی پیدا ہو چکی ہے، اس کا توڑ یہی فتوت اور ایثار کا جذبہ ہے۔

صوفیاء کرام نے اسے اپنے ہاں کتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ انکی کتابوں کے مختلف اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

امام ابوالقاسم القشیریؒ نے مختلف صوفیاء کے اقوال کے ذریعے اس کی تشریح و توضیح کی ہے۔

امام ابوالقاسم قشیریؒ خود ہی فرماتے ہیں۔

”فتوت دراصل یہ ہے کہ انسان ہمیشہ دوسرے کے کاموں میں لگا رہے۔“  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے شیخ ابوعلی دقاقؒ فرماتے ہیں :-

”یہ ایسا کمال ہے جو کا خدا آپ کو حاصل ہے، قیامت میں ہر شخص

”نفسی نفسی اور آپ امتی امتی“ فرمائیں گے۔“

انہی شیخ ابوعلی دقاقؒ سے پوچھا گیا فتوت کیا ہے؟

”انسان اس بات میں قطعاً امتیاز نہ کرے کہ اس کے ہاں ولی کھانا کھا رہا

ہے یا کافر؟“

موجودہ دور میں خولیش پروردی اور اقربانوازی کے مرض کا علاج بجز اس کے

کیا ہو سکتا ہے جو ادب پر شیخ دقاقؒ نے تجویز فرمایا کہ انسان فیض رسانی میں اپنے اور

پرائے کی تمیز سے بالا ہو جائے، ایک اور مقام پر شیخ فرماتے ہیں۔  
فتوت یہ ہے کہ تو دس آدمیوں کو دعوت دے تو فرمایا گیا کہ آجائیں تو تجھ  
میں ناراضگی پیدا نہ ہو۔

اسی ضمن میں شیخ ابوالقاسم قسیریؒ نے ایک عبرت آموز اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے  
جہاں فتوت اپنے نقطہ سرودج پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے، یہ ایک ملاقات کا قصہ ہے جو امام  
جعفر صادقؑ اور شفیق بلخیؒ کے درمیان ہوئی۔

شفیق بلخیؒ نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا فتوت کے کتے ہیں؟ آپ نے  
فرمایا تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا لو وجدنا شکرنا (اگر کچھ مل  
جاتا ہے تو شکر کرتے ہیں) اور لو فقدنا صبرنا (اگر نہیں ملتا تو بیٹھ  
رہتے ہیں) آپ نے فرمایا، ہمارے ہاں مدینہ میں کتوں کا یہی شیوہ  
ہے کہ کچھ مل جاتا ہے تو کھالیتے ہیں نہیں ملتا تو چپ ہو رہتے ہیں، شفیق  
بلخیؒ نے پوچھا آپ فتوت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ فرمایا لو فقدنا  
شکرنا (اگر کچھ نہیں ملتا تو شکر کرتے ہیں) اور لو وجدنا اثرنا (اگر مل  
جاتا ہے تو ایثار کر دیتے ہیں)۔

اسی سلسلے کی ایک سنہری کڑی کے طور پر محمد بن الفضلؒ کا قول ملاحظہ فرمائیے  
زاہد اور مردود کا فرق بیان کرتے ہیں۔

زاہد اس وقت ایثار کرتے ہیں جب غنی ہوں اور جواں مردوں کا ایثار  
تبہ ہوتا ہے جب خود عاجز ہوں۔

مدکرہ صدر احوال اور تعلیمات بلاشبہ ایک انسان کو بے لوث، خلوص کا پیکر  
ایثار کا پتلا اور دریا دل بنانے میں کافی مددگار معاون ثابت ہو سکتی ہیں، اگر ان  
باتوں کو عام رواج دیا جائے اور انہیں بار بار ذہن نشین کرایا جائے تو اس سے

انسان کچھ معمولی میں نہر عجیب بیٹھ کر زندگی گزارنے والا، ترک و تجرد کا متوالا، عافیت  
 کوش اور حجرہ نشین بنتا ہے یا سراپا عمل بن کر میدان میں نکل آتا ہے اور خدا کے  
 حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق ادا کرنے میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے  
 بس یہی تصوف ہے اور کچھ بھی نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسے تصوف پر کوئی شخص  
 کم از کم بقائمی ہوش و خواہش اعتراض نہیں کر سکتا :

<http://t.me/Tehqiqat>



# اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

شیخ جامی فرماتے ہیں:-

زنتھا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

حقیقت بھی یہی ہے کہ انسانی سیرت پر کردار و گفتار دونوں اثر انداز ہوتے ہیں، وہ بات تیر بن کر دل میں کھب جاتی ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلی ہو۔ گفتگو اگر حکمت سے لبریز ہٹھاس سے معمور، دل دردمند کی ترجمان اور حسن بیان سے بھرپور ہو تو ایک ایک حرف اپنا اثر چھوڑتا ہے، صحابہ کرام کی کردار سازی میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ ایمان افزہ کا اثر تھا وہاں آپ کے بیانِ فیضِ ترجمان کی تاثیر کا بھی خاصہ حصہ تھا، چھوٹی چھوٹی مگر حکمت و مواعظت سے لبریز باتیں، تاثیر، کشش اور کیف میں رچے بچھے، اور معارف و مقالق کے خزینے دامن میں لیے ہوئے مختصر اقوال بلاشبہ صحابہ کرام کی سیرتوں پر بے پناہ اثرات مرتب کرتے تھے، اُن سے جہاں ایمان تازہ ہوتا وہاں عرفان کو بھی غذا ملتی، ایک طرف اگر عقل کی گتھیاں سلجھ رہی ہوتیں تو دوسری جانب ذوق و وجدان کی پرورش بھی ہوتی رہتی، گفتار کی شیرینی اور بیان کی حلاوت حلقوم میں اترتی محسوس ہوتی اور دل کی دنیا جذب و شوق سے معمور ہو جاتی۔ جب ہم صوفیاء کرام کی مجالس و محافل کے بارے میں کچھ پڑھتے اور ان کے ملفوظات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی محفل و مجلس ایسا چمنستان نظر آتی ہے جس میں ہر گل اپنا

رنگ اور اپنی ہلک رکھتا ہے، جس کا رنگ آنکھوں کو سرد و بخشتا اور خوشبو شام جان کو مسطر رکھتی ہے، جب بزرگوں کی مجلسیں عروج پر پہنچیں تو دلکش مثالوں اور حکایتوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے عمیق ترین حقائق چٹکیوں میں حل ہوتے جاتے۔ مغل پر کبھی جذب جنون طاری ہوتا کبھی عقل و خرد کی جلوہ آرائی، کبھی ایمان و عرفان کی اور کبھی جنت کی شاہدوں کا ذکر اور کبھی جہنم کی وادیوں کا تذکرہ، مغل میں رحمت و شفقت حق کا ذکر آتا تو ہرے تبتا لٹھے، عذاب و عتاب کی بات چلتی تو آنسوؤں کی جھڑپاں لگ جاتیں، احترام انسانیت کا موضوع چھڑاتا تو موتی لٹھے۔ تعلیم آدمیت کا مسئلہ آتا تو دریا بہتے، خدا کے عدل پر لب کشائی ہوتی تو چٹخیں نکل جاتیں، اس کے فضل پر زبان کھلتی تو باچھیں کھل جاتیں، غیرت فقر کا مضمون نوک زبان ہوتا تو بوریہ نشینوں اور خرقہ پوشوں کے سر میں سکندر کا دماغ آجاتا حدیث خلیق کی بحث نطق آشنا ہوتی تو پندار و ناموس کے آہگینے چھنا کے سے ٹوٹ جاتے، مع اللہ کا تصور پیش ہوتا تو درمیان میں سے مخلوق نکل جاتی "مع المخلوق" پر اظہار خیال ہوتا تو نفس غائب ہو جاتا، صوفیاء کرام کی باتیں ایجاز و اختصار کا بہترین مرقع ہوتی تھیں، قطرے میں دریا اور ذرے میں مہر کو انہوں نے سمو کر دکھایا، صوفیاء کرام کی مجلسوں میں اپنوں اور غیروں کی کجائی کا عجب سماں نظر آتا، نہ کسی پر تنقید نہ کسی پر تعریف، گفتگو میں نہ مناظرانہ پن اور نہ کسی کی لازمی کاشائید، بات وہی کہی جو ہر ایک کے دل کی تھی، دل سے نکلی دل پر بیٹھی، چلے کھینچنے سے پیلے کھب گئی، کوئی دیران دل لے کر بیٹھا، آباد دل لے کر اٹھا، خالی ہاتھ پہنچا دامن بھر کر گیا، تھکا ماندہ آیا، ہشاش بشاش رخصت ہوا، صوفیاء کی مجلس گویا صحرا کے پیادہ پا مسافروں کے لیے گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں ہوتی تھی،

صوفیاء کس و نشین انداز میں لوگوں کی اصلاح تربیت کرتے تھے، ان کے ہاں بیٹھنے والے کس قسم کے انسان بن کر نکلتے ہوں گے اور محافل و مجالس کیسی ایمان

افروز ہوتی ہوں گی، جہاں احترامِ انسانیت، خوفِ خدا، خدمتِ خلق، بخت، تقویٰ، اخلاص، عجز و نیاز، ایثار، توکل اور حسنِ اخلاق کے پرچے ہوتے تھے، ایسی ہی پسند معائن کی جھکیاں ملاحظہ فرمائیں۔

دہلی میں خانوادہٴ چشت کے ممتاز رہنما کا دربار بجا ہے، بڑے چھوٹے، ایک ہی مجلس میں برتری اور کمتری کے احساس سے بالا ہو کر بیٹھے ہیں، ستاروں کے اس ہالے میں خواجہ نظام الدین دہلویؒ چاند بن کر مفضل آراء ہیں اور فرما رہے ہیں :-  
 "ایک شخص نے خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی خدمت میں چھری پیش کی، فرمایا مجھے چھری نہ دو، مجھے سوئی لا دو۔ میں کاٹتا نہیں جوڑنے آیا ہوں۔" بلکہ

یہ ہے برائے وصل کردن آدمی" کی تفسیر  
 "علم و عمل کے باہم لازم و ملزوم ہونے اور ان کی اہمیت و ضرورت کتنی ہے اسے شیخ بہاؤ الدین نقشبندؒ نے کس خوبصورتی سے واضح کیا، مجلس کی ایک جھلک اور گفتگو کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے۔

"تو شمع کی طرح بن، تو شمع کی طرح نہ بن، شمع کی طرح بن یاں معنی کہ دوسرے کو روشنی پہنچائے اور شمع کی طرح نہ بن یاں معنی کہ تو خود تاریکی میں رہے۔" بلکہ

توکل اور توکل کی روح کیا ہے؟ حضرت ابو بکر شبلیؒ فرماتے ہیں :-  
 "ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کثیر العیال ہونے کی شکایت کی، فرمایا ان انسراؤ کو گھر سے نکال دو جن کا رزق اللہ کے ذمہ نہیں۔" بلکہ

عجیب و غریب افعال کے صدور اور خرقِ عادت واقعات کے ظہور ہی کو

صرت کرامت سمجھا جاتا ہے اور اسے عام ذہن معیار ولایت قرار دیتے ہیں مگر اس  
المجمن کو شیخ بہاء الدین نقشبندؒ نے بڑے حسن کارانہ انداز میں سلجھایا ہے، لوگوں نے  
آپ سے کرامت طلب کی تو فرمایا:-

”یہی کرامت کیا کم ہے کہ اتنے گناہوں کے باوجود ہم روئے زمین پر

چل پھر رہے ہیں۔“

صوفیاء کے ہاں خود بینی کے بجائے خود نکستی کا راج زیادہ ہوتا ہے پھر پوچھ لو پھر گئے فرست کی بہ  
نسبت بیچ میرزی کا چلن عام ہے، اس ضمن میں خواجہ نظام الدین دہلویؒ کی مجلس کا  
ایک گوشہ پیش نظر رکھیے، آپ فرما رہے ہیں:-

”جسے دیکھو اسے اپنے سے بہتر سمجھو اگرچہ تم اطاعت گزار ہو اور وہ

گنہ گار ہو، ہو سکتا ہے کہ یہ تمہاری آخری لامعت اور اسکا آخری گناہ ہو تم

گنہ گار بن جاؤ لہذا دیکھو کار بن جائے۔“

شعلہ و شبنم کی کیجانی، آتش شوق اور باران اشک کی ہم آغوشی جیسی مجازی کیفیت

کو حقیقت کا روپ شیخ ابوبکر شبلیؒ نے کیسے دیا، ملاحظہ فرمائیے،

آپ مجلس میں صدر نشین تھے، قریب ہی گیلی لکڑیاں جل رہی تھیں ایک طرف

آگ تھی، دوسرے سرے سے پانی رس رہا تھا، آپ حاضرین مجلس کی طرف متوجہ

ہوئے، فرمایا:-

”اگر یہ بات سچ ہے کہ تمہارے دل آتش شوق میں جل رہے ہیں تو

تمہاری آنکھوں میں آنسو رواں کیوں نہیں ہوتے؟“

لوگ نہ جانے عقل و دولت کے کتنے ہیں، اس کی کیا نشانی ہے؟ اس مسئلہ

میں شیخ ابوعلی محمد بن عبدالوہابؒ کا نقطہ نظر نصیحت آموز بھی ہے اور بعیرت لغوز

بھی، فرماتے ہیں:-

”اُف ہے دنیا کے کاموں پر جب وہ اُمڈ کر آجائیں اصاف ہے دنیا کی حسرتوں پر جب وہ جاتی رہیں، عقلمند ایسی چیز کی طرف ہرگز توجہ نہیں دیتا، کہ آئے تو مشغولیت کا سبب ہو اور جائے تو حسرت کا۔“ مجھے غیبتِ زنا سے سخت، مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف، مگر اخلاقی پستی کی انتہا لیکن یہ سب کچھ بدگوئی میں شامل ہے، مگر بدخواہی، شیخ نظام الدین اویازؒ فرماتے ہیں:-

”بڑا کنا بڑا ہے مگر بڑا چاہنا اس سے بھی بدتر ہے۔“ سنئے اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرو: یہ قرآن مجید کا حکم ہے کتنا خرچ کرو؛ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شرح مقرر کر دی، رہے صدقاتِ نافلان کی صرف ترغیب ملتی ہے، مگر اس اہم ترین مسئلہ کو جس نے پوری دنیا کا سکون تلپٹ اور دماغ چاٹ رکھا ہے، صوفیاء کرام کس نظر سے دیکھتے ہیں؛ حضرت ابو بکر شبلی کا رنگ ملاحظہ ہو، پوچھنے والے نے پوچھا:-

”زکواہ کب اور کتنی واجب ہے؛ فرمایا مذہب کی فقہ کی رو سے یا مذہب فقہاء کی نظر میں؛ سائل نے کہا دونوں طرح سے ارشاد فرمائیے جواب ملا، فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ سال گزرنے پر سو درہم میں سے ڈھائی روپے نکال دو، اور فقہاء کے مذہب میں یہ ہے کہ جو کچھ مال و دولت ہو، سب کی راہ میں لٹا دو۔“ سنئے

انسان فطراناً مدنی الطبع ہے، مل جل کر رہتا اور لو اور دو کے اصول پر عمل کرتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے، اس کے کچھ فرائض ہیں اور کچھ حقوق، انسانوں کی بستی میں مفلاً ہکراتے بھی ہیں اور جھگڑے بھی پیدا ہوتے ہیں، مگر صوفیاء کرام انسان کو زندگی گزارنے کا کیا چنگ سکھاتے ہیں؛ تجارتی بنیادوں پر زندگی؛ کچھ لو اور کچھ دو کے اصولوں پر

زندگی، جیو اویسے دو کی پالیسی والی زندگی، تحفظ خویش کے نظریہ کی زندگی؟ نہیں، یوں نہیں، بلکہ صوفیاء کرام ترک و ایثار اور صروت، اخوت سے معمور زندگی کا درس دیتے ہیں، "بھلا کر بھلا ہوگا" کے بجائے "سب کا بھلا" ان کا نعرہ مستانہ ہوتا ہے "دوستوں سے گلہ" ان کا شیوہ نہیں اور شکایتِ زمانہ "ان کا شعار نہیں، شیخ جنیدؒ بعد ازیں اس نظریے کی یوں ترجمانی فرماتے ہیں:-

"کوئی شخص اس وقت تک عارف نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ زمین کی طرح نہ ہو جائے کہ نیک و بد اسے روندتے ہیں اور بادل کی طرح نہ ہو جائے جو ہر چیز پر سایہ کرتا ہے اور سورج کی طرح نہ ہو جائے جو ہر ذرے کو روشن کرتا ہے اور بادش کی طرح نہ ہو جائے جو ہر چیز کو سیراب کرتی ہے۔"۔

تصوف کا دستور اور اہل تصوف کا شروع سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ہر کام میں مقصدیت کے مشکلاشی ہوتے ہیں، ان کے نزدیک ایسا علم محض الفاظ کا گورکھ و ہندہ ہے جو عمل سے خالی ہے، وہ الفاظ و حروف کے رٹنے کو صرف دماغ سوزی قرار دیتے ہیں، عمل کے لیے تو علم ضروری ہوتا ہی ہے مگر علم کے لیے عمل اس سے بھی زیادہ ضروری ہے، ورنہ علم بے معنی، خیالات کا ٹانگ اور افکار کی شعبہ بندی بن جاتا ہے، اسی نظریے کو ایک مرد حق آگاہ نے یوں واضح کیا۔

"خواجہ نظام الدین دہلویؒ نے مکارم اخلاق کے بارہ میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: "شیخ ابوسعید البوالخیرؒ اور ابوعلی سیناؒ کی ملاقات ہوئی، رخصت ہونے سے قبل ابوعلی سیناؒ نے ایک صوفی سے جو حضرت شیخ کے کے ملازموں سے تھا یہ فرمائش کی کہ جب میں حضرت شیخؒ کے یہاں سے رخصت ہو جاؤں تو پھر وہ جو کچھ میرے بارے میں کہیں تم مجھے لکھ بھیجنا

بوعلی سینا چلے گئے مگر حضرت شیخؒ نے ان کا کوئی ذکر نہ کیا، ان کے بارے میں اچھی یا برسی کسی قسم کی رائے کا اظہار نہ فرمایا، چنانچہ ایک روز اس صوفی نے پوچھ ہی لیا کہ بوعلی سینا کیسا آدمی ہے؟ حضرت شیخؒ نے جواب دیا وہ ایک فیلسوف شخص ہے، طبیب ہے بڑا عالم بھی ہے البتہ مکارم اخلاق کا مالک نہیں (اما مکارم اخلاق ندارد) اس صوفی نے یہ بات بوعلی سیناؒ کو کلمہ بھیجی، بوعلی سیناؒ نے حضرت شیخؒ کی خدمت میں کچھ تحریر کیا، جس میں یہ بھی مذکور تھا کہ میں نے اتنی کتابیں مکارم اخلاق کے بارے میں لکھی ہیں، پھر حضرت شیخؒ نے یہ کیوں کہتے ہیں کہ میں مکارم اخلاق کا مالک نہیں، حضرت شیخؒ نے قسم فرمایا اور گویا ہوئے، میں نے تو یہ نہیں کہا کہ بوعلی سیناؒ مکارم اخلاق جانتا نہیں (من نگفتہ ام کہ بوعلی مکارم اخلاق ندارد) میں نے تو یہ کہا ہے کہ وہ مکارم اخلاق کا مالک نہیں۔ (مکارم اخلاق ندارد) اے!

## رُوحِ تَصَوُّفِ

۱۔ تاریخ تصوف؛ رئیس احمد جعفریؒ ص ۲۳۱، ۲۳۲

۲۔ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ؛ پروفیسر نور بخش توکلی، ص ۲۶۲۔ مطبوعہ نوری بک ڈپو، لاہور،

۳۔ تجدید تصوف و سلوک؛ مولانا عبدالباری ندوی، ص ۱۹، ۱۸۔ مطبوعہ لکھنؤ،

۴۔ مقدمہ ابن خلدون، ترجمہ سعد حسن خان یوسفی ص ۲۲۶۔ مطبوعہ نوری محمد کارخانہ تجارت

کتب کراچی۔

۵۔ الکشف عن مہمات التصوف؛ مولانا اشرف علی تھانویؒ، ص ۳۸۔ مطبوعہ

سجاد پبلشرز لاہور۔

۶۔ تعرف، محمد بن اسحاق کلاباذمیؒ؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۲۔ مطبوعہ المعارف لاہور،

۷۔ تاریخ تصوف؛ پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ ص ۲۶۹۔ مطبوعہ علماء اکیڈمی محکمہ

ادقاف لاہور۔

۸۔ تعرف، محمد بن اسحاق کلاباذمیؒ؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۳۸۔ مطبوعہ

المعارف لاہور۔

۹۔ ایضاً ص ۱۳۸

۱۰۔ ایضاً ص ۱۳۸

۱۱۔ علم تصوف، عباد الشراختر ص ۲۳۔ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

۱۲۔ رسالہ قشیریہ؛ امام ابوالقاسم قشیریؒ؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۳۳۔ مطبوعہ

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۳۔ ایضاً



- ۱۳۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۳۲ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۱۵۔ ایضاً . . . . .
- ۱۷۔ ایضاً . . . . .
- ۱۸۔ ایضاً . . . . .
- ۱۹۔ ایضاً . . . . .
- ۲۰۔ ایضاً . . . . .
- ۲۱۔ کشف المحجوب: سید علی البحریریؒ، ترجمہ: میاں طفیل محمد ص ۹۲ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز، لاہور۔
- ۲۲۔ ایضاً . . . . .
- ۲۳۔ ایضاً . . . . .
- ۲۴۔ کشف المحجوب، سید علی البحریریؒ، ترجمہ سید ابوالحسنات ص ۱۳۱ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۲۵۔ فتوح الغیب: شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ترجمہ سید محمد فاروق القادری، ص ۱۳۱ مطبوعہ المعارف - لاہور۔
- ۲۶۔ آداب المریدین: شیخ ضیاء الدین سروردی: محمد عبدالباسط ص ۲۵ مطبوعہ المعارف لاہور
- ۲۷۔ ایضاً . . . . . ص ۲۵
- ۲۸۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۳۲ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۲۹۔ ایضاً . . . . .



## شرعیات و طریقت

۱۔ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش ص ۲۲ مطبوعہ انجمن خدام القرآن لاہور۔

۲۔ مسرج : شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ: ترجمہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ص ۶ مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور

۳۔ ایضاً . . . ص ۶۲

۴۔ رسالہ قشیریہ : شیخ ابوالقاسم قشیریؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۶۲ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۵۔ ایضاً ص ۶۳

۶۔ ایضاً ص ۶۳

۷۔ مکتوباتِ صدی : شیخ یحییٰ منیریؒ: ترجمہ شاہ نجم الدین فروسی ص ۳۰۱  
۸۔ صد میدان : شیخ عبداللہ الفاریؒ: ترجمہ پروفیسر افضل نقر ص ۱۵ مطبوعہ المعارف لاہور۔

۹۔ مکتوباتِ صدی : شیخ یحییٰ منیریؒ: شاہ نجم الدین فروسی ص ۳۰۲

۱۰۔ ایضاً ص ۲۱۳

۱۱۔ عوارف المعارف : شیخ شہاب الدین سہروردیؒ: ص ۸۸ مطبوعہ

نفیس اکیڈمی کراچی

۱۲۔ رسالہ قشیریہ : شیخ ابوالقاسم قشیریؒ: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۶ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۳۔ رسالہ قشیریہ، شیخ ابوالقاسم قشیری، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۶۳ مطبوعہ  
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد،

۱۴۔ ایضاً ص ۶۴

۱۵۔ ایضاً ص ۶۵

۱۶۔ تاریخ تصوف، پروفیسر یوسف سلیم چشتی ص ۲۰۵ مطبوعہ علماء اکیڈمی اوقاف لاہور،

۱۷۔ ایضاً ص ۱۹

۱۸۔ فوائد الفواد، خواجہ نظام الدین دہلوی، مرتبہ، خواجہ حسن دہلوی، ترجمہ پروفیسر  
محمد سرور مطبوعہ محکمہ اوقاف لاہور

۱۹۔ رسالہ قشیریہ، شیخ ابوالقاسم قشیری، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۴۶ مطبوعہ ادارہ  
تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۲۰۔ عوارف المعارف، شیخ شہاب الدین سہروردی مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی۔

## کشف و کرامت

- ۱۔ فوائد القواد، خواجہ حسن دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر محمد سرور صاحب ۲۵۱ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب (لاہور)
- ۲۔ مکتوبات مجددؒ: شیخ احمد سرہندیؒ، ترجمہ مولانا سعید احمد نقشبندی، دفتر اول ۲۱۲ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔
- ۳۔ انفاس العارفين، شاہ ولی اللہ: ترجمہ سید محمد فاروق القادری ص ۵ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۴۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم القشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۴۲ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۵۔ مکتوبات مجددؒ: شیخ احمد سرہندیؒ، ترجمہ مولانا سعید احمد نقشبندی ص ۲۹۴ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔
- ۶۔ فوائد القواد: خواجہ حسن دہلویؒ، ترجمہ پروفیسر محمد سرور صاحب ۲۴ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۷۔ انفاس العارفين: شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ترجمہ سید محمد فاروق القادری ص ۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔



۱۳۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت: پروفیسر محمد ایوب قادری، ص ۶۷ مطبوعہ ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی۔

۱۴۔ تاریخ دعوت و عمریت: مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۵۹ ج ۱ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔

۱۵۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۳۲۳ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔

۱۶۔ رود کوثر۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ص ۸۸ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔

۱۷۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۳۲۵ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔

۱۸۔ تذکرہ مشائخ قادریہ۔ محمد دین کلیم ص ۱۰۷ مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور۔

# آئین جوان مردان حق گوئی و بیباکی

- ۱- تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۶۶، ۶۵، مطبوعہ دارالمؤلفین اسلام آباد،
- ۲- ایضاً . . . . . ص ۷۶
- ۳- تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ج ۱ ص ۲۷۹ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔
- ۴- ایضاً . . . . .
- ۵- فیوض یزدانی: مجلس ص ۵۱
- ۶- تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ج ۳ ص ۱۶۳-۱۶۴ مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی۔
- ۷- آب کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، ص ۴۱۲ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔
- ۸- ایضاً . . . . .
- ۹- ایضاً . . . . . ص ۲۵۸
- ۱۰- ایضاً . . . . .
- ۱۱- تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۲۲ مطبوعہ دارالمؤلفین اسلام آباد۔
- ۱۲- رود کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ص ۸۸ مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔
- ۱۳- مخدوم جہانیاں جہاں گشت، پروفیسر محمد ایوب قادری ص ۶۶ ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی۔
- ۱۴- تذکرہ مشائخ نقشبندیہ: نور بخش توکلی ص ۲۷۳-۲۷۴ مطبوعہ نوری بک پبلشرز لاہور۔



## فقیر غنیور

- ۱- الشعراء : ۱۰۵ تا ۱۰۹
- ۲- الشعراء : ۱۲۳ تا ۱۲۷
- ۳- الشعراء : ۱۴۱ تا ۱۴۵
- ۴- الشعراء : ۱۶۰ تا ۱۶۴
- ۵- الشعراء : ۱۸۰
- ۶- یسین : ۲۱ - ۲۲
- ۷- الشوری : ۲۳
- ۸- معارف الحدیث : مولانا محمد منظور نعمانی ج ۲ ص ۱۰۹
- ۹- خطہ پاک ادب : شہاب دہلوی، عاشیہ کمالہ اخبار الاخبار، ص ۲۶۵  
مطبوعہ اردو اکیڈمی بہاولپور۔
- ۱۰- فوائد القواد، خواجہ نظام الدین دہلوی، ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۷۵ مطبوعہ  
محکمہ اوقاف لاہور۔
- ۱۱- سیر العارفين : حامد بن فضل اللہ جمالی، ترجمہ محمد ایوب قادری ص ۲۸ مطبوعہ  
مرکزی اردو بورڈ لاہور۔
- ۱۲- فوائد القواد، خواجہ نظام الدین دہلوی، ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۱۸-۲۱۹  
مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۱۳- تاریخ مشائخ چشت : خلیق احمد نظامی ص ۱۹۳ مطبوعہ دارالوفاقیین اسلام آباد۔
- ۱۴- . . . . . ص ۱۳۸ . . . . .





# توکل

۱- یونس : ۸۴

۲- المائدہ : ۲۳

۳- یونس : ۷۱

۴- الاعراف : ۸۹

۵- یونس : ۸۴

۶- الشعراء : ۲۱۷

۷- الرعد : ۳۰

۸- ہود : ۸۸

۹- آل عمران : ۱۵۸

۱- رسالہ قشیریہ امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن، ص ۲۶۳ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

۱۱- تعرف، محمد بن اسحاق کلابازیؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن، ص ۱۵۵ مطبوعہ المعارف لاہور

۱۲- ایضاً . . . . .

۱۳- ایضاً . . . . . ص ۱۵۶

۱۴- رسالہ قشیریہ، ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ پیر محمد حسن، ص ۲۶۳ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۵- ایضاً . . . . . ص ۲۶۴

۱۶- منہاج العابدین، امام غزالیؒ، ترجمہ مولانا سعید احمد نقشبندی، ص ۸۴ مطبوعہ



## فقہ

- ۱۔ کشف المحجوب: سید علی البحریری، ترجمہ ایف ڈی گوہر ص ۸۴
- ۲۔ ایضاً . . . . . ص ۸۶
- ۳۔ آداب المریدین: شیخ ضیاء الدین سہروردی، ترجمہ محمد عبدالباسط ص ۱۹  
مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۴۔ تعارف: محمد بن اسحاق کلاباذی، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۴۶ مطبوعہ المعارف لاہور
- ۵۔ رسالہ قشیریہ: ابوالقاسم القشیری، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۲۶ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۶۔ تعارف: محمد بن اسحاق کلاباذی، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۴۶ مطبوعہ المعارف لاہور
- ۷۔ کشف المحجوب: سید علی البحریری، ترجمہ ایف ڈی گوہر ص ۸۶
- ۸۔ رسالہ قشیریہ: ابوالقاسم القشیری، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۱۹ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۹۔ ایضاً . . . . . ص ۲۱۸
- ۱۰۔ ایضاً . . . . . ص ۲۱۶
- ۱۱۔ تعارف: محمد بن اسحاق کلاباذی، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۴۶ مطبوعہ المعارف لاہور
- ۱۲۔ رسالہ قشیریہ: ابوالقاسم قشیری، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۱۹ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

## توبہ

- ۱۔ صدی میدان؛ شیخ عبداللہ انصاری؛ ترجمہ پروفیسر افضل فقیر ص ۱۷۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۲۔ النساء : ۱۱۷
- ۳۔ النمل : ۱۱۹
- ۴۔ شکوۃ المعاصیح، باب الاستغفار والتوبہ، ص ۵۱ مطبوعہ رحمانیہ لاہور۔
- ۵۔ صدی میدان؛ شیخ عبداللہ انصاری؛ ترجمہ پروفیسر افضل فقیر ص ۱۷۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۶۔ تعرف؛ امام ابوالسحاق کلاباذمی؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۰ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۷۔ ایضاً . . . . . ص ۱۲۰
- ۸۔ ایضاً . . . . . ص ۱۲۱
- ۹۔ رسالہ قشیریہ؛ امام ابوالقاسم قشیری؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۱ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۱۰۔ تعرف؛ امام ابوالسحاق کلاباذمی؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۱ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۱۱۔ رسالہ قشیریہ؛ امام ابوالقاسم قشیری؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۲۱ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۱۲۔ ایضاً . . . . .
- ۱۳۔ ایضاً . . . . . ص ۱۲۱

## تقویٰ

- ۱۔ المائدہ ، ۲
- ۲۔ رسالہ قشیریہ ، ابوالقاسم قشیریؒ ، ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۹۸ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلام آباد۔
- ۳۔ عوارف المعارف ، شیخ شہاب الدین سروردیؒ ص ۱ مطبوعہ نفس اکیڈمی کراچی ۔
- ۴۔ رسالہ قشیریہ : ابوالقاسم قشیریؒ ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۲۳ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔
- ۵۔ بخاری و مسلم ۔
- ۶۔ مشکوٰۃ ۔
- ۷۔ فتوح الغیب : شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ؛ ترجمہ سید محمد فاروق القادری ص ۸۶ مطبوعہ المعارف لاہور ۔
- ۸۔ رسالہ قشیریہ : امام ابوالقاسم قشیریؒ ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۰۷ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلام آباد۔
- ۹۔ کیمیائے سعادت ، امام غزالیؒ ؛ ترجمہ مجید زیدانی ص ۹۲۸۔ مطبوعہ ناشران قرآن لاہور ۔
- ۱۰۔ رسالہ قشیریہ : امام ابوالقاسم قشیریؒ ؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۱۲ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلام آباد۔
- ۱۱۔ تعریف ، ابوالسحاق کلاباذمیؒ ؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۴۹ مطبوعہ المعارف لاہور۔



۱۲۔ کیمیائے سعادت، امام غزالیؒ: ترجمہ مجید یزدانی، ص ۹۳۱ مطبوعہ ناشران  
قرآن لاہور۔

۱۳۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم القشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۰۶ مطبوعہ  
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۴۔ کیمیائے سعادت، امام غزالیؒ، ترجمہ مجید یزدانی، ص ۹۲۴ مطبوعہ  
ناشران قرآن لاہور۔

۱۵۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۳۱ مطبوعہ  
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۱۶۔ صد میدان: شیخ عبدالشہ انصاری: ترجمہ پروفیسر افضل فقیر ص ۷۷ مطبوعہ  
المعارف لاہور۔



## صبر

- ۱- آل عمران : ۱۸۶
- ۲- البقرہ : ۱۷۷
- ۳- آل عمران : ۱۳۲
- ۴- آل عمران : ۱۲۰
- ۵- صدمیدان : شیخ عبداللہ انصاریؒ: ترجمہ پروفیسر افضل فقیر، ص ۲۹۷ مطبوعہ المعارف لاہور۔
- ۶- تعرف، ابوالسحاق کلاباذیؒ: ترجمہ: ڈاکٹر پیر محمد حسن، ص ۱۳۳ مطبوعہ المعارف لاہور،
- ۷- رسالہ تشریح: ابوالقاسم قشیریؒ، ترجمہ: ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۲۹۶ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔
- ۸- ایضاً
- ۹- طریق النجات: شیخ محمد حسن مجددی فاروقیؒ ص ۱۳۸

# فتوت

- ۱- الحشر: ۱  
 ۲- رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیریؒ؛ ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ۲۵۲۷ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔

- ۳- ..... ۲۵۵  
 ۴- ایضاً ..... ۲۵۶  
 ۵- ایضاً ..... ۲۵۷  
 ۶- ایضاً ..... ۲۶۰  
 ۷- ایضاً ..... ۹۳

# ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

- ۱۔ فوائد الغواد: خواجہ نظام الدین دہلوی: ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۲۳ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۲۔ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ: نور بخش لوہی: ص ۱۲۷ مکتبہ نوری بکڈپو لاہور۔
- ۳۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیری: ترجمہ پیر محمد حسن ص مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔
- ۴۔ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ: نور بخش لوہی: ص ۱۳۱ مطبوعہ نوری بکڈپو لاہور۔
- ۵۔ فوائد الغواد: خواجہ نظام الدین دہلوی: ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۱۶۶ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۶۔ تذکرہ مشائخ قادریہ، محمد دین کلیم ص ۸۷ مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور۔
- ۷۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیری: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۸۷ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۸۔ فوائد الغواد: خواجہ نظام الدین دہلوی: ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۲۱۲ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔
- ۹۔ مکتوبات صدی، شیخ شرف الدین بکھی انیسری: ترجمہ شاہ نجم الدین فردوسی، ص ۳۵۔
- ۱۰۔ رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم قشیری: ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
- ۱۱۔ فوائد الغواد: خواجہ نظام الدین دہلوی: ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص ۳۶۱ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور۔

# اشاریہ

## الف

۱۸۳	آدم علیہ السلام
۱۴۸	آدم ، بنوری ، شیخ ،
۱۰۰ ، ۹۹ ، ۹	آرنلڈ ، پروفیسر ،
۵۰	ابراہیم (علیہ السلام)
۱۶۳	ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ ،
۱۹۳	ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ ،
۱۱۷	ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ ، دقاق شیخ ،
۱۴۷	ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ ، عادل ،
۱۸۳	ابلیس ،
۸۳	ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ، امام ،
۴۴	ابن خلدون ، علامہ ،
۷۸	ابن خلکان ،
۱۷	ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ ، محی الدین ، شیخ ،
۴۷	ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ -
۱۰۲	ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ، گازرونی ،
۶	ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ، طمسانی ،
۱۹۹ ، ۲۸	ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ، کفانی ،
۱۹۴ ، ۱۶۴ ، ۱۷۳ ، ۱۷۰ ، ۷۸ ، ۷۷ ، ۵۳ ، ۵۱ ، ۱۷	ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ، محمد بن اسحاق ،

- ۱۴۶ ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ ، دراتق بیخ ،
- ۱۵۳ ابو تراب رحمۃ اللہ علیہ ، نخشی ،
- ۱۶۱ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ ، حداد ،
- ۱۶۵ ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ ،
- ۲۹ ابو الحسن رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ ،
- ۱۴۹ ، ۵۳ ابو الحسن رحمۃ اللہ علیہ ، سیروانی ، شیخ ،
- ۱۶ ، ۱۴۰ ابو الحسن ، علی ، ندوی مولانا ،
- ۶۵ ابو الحسن رحمۃ اللہ علیہ ، قوشچی ،
- ۲۹ ابو الحسن رحمۃ اللہ علیہ ، مزین ،
- ۱۶۰ ابو الحسن رحمۃ اللہ علیہ ، دراج شیخ ،
- ۱۴۶ ، ۶۱ ، ۵۳ ، ۲۹ ، ۲۷ ، ۸ ، ابو الحسین رحمۃ اللہ علیہ ، نوری ، شیخ ،
- ۲۰۵ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ ، ابو الخیر ، شیخ ،
- ۲۹ ، ۸ ابو سهل ، رحمۃ اللہ علیہ ، صلومی ، شیخ ،
- ۵۶ ابو عثمان رحمۃ اللہ علیہ ، حیری ، شیخ ،
- ۶۰ ابو العلاء رحمۃ اللہ علیہ ، امیر شیخ ،
- ۵۶ ابو علی رحمۃ اللہ علیہ ، احمد ، شیخ ،
- ۱۹۶ ، ۱۶۴ ، ۱۶۹ ، ۱۶۱ ابو علی رحمۃ اللہ علیہ ، دقاق ، شیخ ،
- ۲۰۳ ابو علی ، محمد بن عبد الوہاب ،
- ۱۶۱ ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ ، امام ،
- ۱۸۳ ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ ، دمشقی ،
- ۱۴۵ ابو الفتح رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ ،
- ۵۶ ابو التاسم رحمۃ اللہ علیہ ، دمشقی ،
- ۱۸۸ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ ، رویم البغدادی -

- ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ ، یسین ، شیخ : ۱۷۰
- ابونعیم : ۱۶
- ابوالوفار ، یحییٰ ، قاضی : ۱۱۴
- ابولیعقوب رحمۃ اللہ علیہ ، سوسی : ۱۸۹ ، ۵۴
- احرار رحمۃ اللہ علیہ ، عبید اللہ ، خواجه : ۱۴۷ ، ۶۶
- احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ، امام : ۲۳
- احمد بن یحییٰ الجلاء رحمۃ اللہ علیہ : ۱۷۰
- احمد خان بہمنی ، سلطان : ۱۴۷
- احمد رحمۃ اللہ علیہ ، سرہندی ، شیخ : ۱۲۲ ، ۴۲
- احمد کبیر رحمۃ اللہ علیہ ، سید : ۱۰۲
- احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ : ۱۸۴
- اسحاق ( علیہ السلام ) : ۵۰
- اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ : ۱۰۲ ، ۹۹
- اشرف ، جہانگیر ، سمنانی ، شیخ : ۱۴۳
- اشرف علی ، تھانوی ، مولانا : ۴۵
- افضل خان : ۱۲۳
- اقبال رحمۃ اللہ علیہ ، علامہ : ۶۴
- اکبر ، بادشاہ : ۱۴۸ ، ۱۴۷ ، ۱۲۲ ، ۱۱۴
- اکرام ، محمد ، ڈاکٹر ، شیخ : ۱۴۳ ، ۱۰۲
- التمش ، شمس الدین ، سلطان : ۱۴۴ ، ۱۱۹ ، ۱۲۳ ، ۱۳۴ ، ۱۴۴ ، ۱۴۶
- امیر حسن رحمۃ اللہ علیہ ، علامہ : ۷۲
- امیر محمد خان ، امیر الدولہ : ۱۴۱
- انس رضی اللہ عنہ ، حضرت : ۱۷۹ ، ۱۷۲



۱۴۴ ، ۵۰

ایوب (علیه السلام) :

# ب

۱۲۱

بابر ، ظہیر الدین ، سلطان :

۴۳

بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ ، اسحاق ، خواجہ :

۱۴۴ ، ۱۴۳

برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ ، بلخی ، شیخ :

۱۱۷

برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ :

۱۰۱

برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ ، عزیز ، شیخ ،

۱۴۴ ، ۱۴۳

برہان الدین مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ :

۱۹۳ ، ۹۷ ، ۵۷

بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ، بایزید ، شیخ :

۲۳

بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ :

۱۴۴ ، ۱۳۶

بلبن ، غیاث الدین ، سلطان :

۱۴۹

بلند اقبال ، شہزادہ :

۱۷۵

بو شہی رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ :

۲۰۵

بو علی ، سینا :

۱۰۳

بو علی رحمۃ اللہ علیہ ، قلندر :

۱۴۴ ، ۱۲۰ ، ۱۱۹

بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ ، زکریا :

۲۰۳ ، ۲۰۲ ، ۱۷۸

بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ ، نقشبند :

۱۴۹

بہمن یارخان :

# ت

۱۳۳

تبرک ، نور ، شیخ :

۱۸۹ ، ۱۴۰ ، ۱۶۰ ، ۱۵۴ ، ۲۶

تستری رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ :

۲۳۲

- ۱۱۶ ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۱۲۶ : تعلق ، فیروز ، سلطان  
 ۱۱۶ ، ۱۲۰ : تعلق ، محمد ، سلطان  
 ۱۱۹ : تملنگی خان ،  
 ۱۲۹ : تذکر رحمتہ الشد علیہ ، انبالوی شاہ :

ج

- ۹۶ : جالینوس :  
 ۲۰۰ ، ۱۶ : جامی رحمتہ الشد علیہ ، عبدالرحمن ، ملا :  
 ۱۳۸ : جان جاناں رحمہ الشد علیہ ، مرزا ،  
 ۴۱ : جبرائیل علیہ السلام :  
 ۲۸ ، ۸ : جریری رحمتہ الشد علیہ ، ابو محمد ، شیخ :  
 ۱۹۸ : جعفر صادق رحمتہ الشد علیہ ، امام :  
 ۱۰۲ : جلال الدین رحمتہ الشد علیہ ، بخاری ، سید :  
 ۱۲۶ ، ۱۰۳ : جلال الدین رحمتہ الشد علیہ ، تبریزی :  
 ۱۹۱ ، ۶۶ ، ۶۲ ، ۶۱ ، ۶۰ ، ۵۲ ، ۴۷ ، ۴۶ ، ۶ : جنید بغدادی رحمتہ الشد علیہ ، شیخ :  
 ۲۰۵ ، ۱۹۳ ، ۱۸۵ ، ۱۸۴

- ۱۶۵ ، ۱۶۳ : جنید بن محمد رحمتہ الشد علیہ ، شیخ :  
 ۱۲۸ : جہانگیر ، نور الدین ، بادشاہ :

ح

- ۱۸۳ : حاتم اسم رحمتہ الشد علیہ ، شیخ :  
 ۹۲ ، ۷۶ ، ۷۲ : حارث المحاسبی رحمتہ الشد علیہ :  
 ۱۲۶ ، ۱۲۵ ، ۱۳۷ : حامدین فضل الشد ، جمالی :

marfat.com

- ۱۸۸ : حذیفہ رحمۃ اللہ علیہ ، مرعشی ،  
 ۱۰۱ : حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ مولانا ،  
 ۲۹ : حسن رحمۃ اللہ علیہ ، بصری ، خواجه ،  
 ۷۲ : حسن رحمۃ اللہ علیہ ، دہلوی ، خواجه ،  
 ۵۳ : حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ ،  
 ۱۲۷ : حسین رحمۃ اللہ علیہ ، شاہ ،  
 ۵۰ : حصری رحمۃ اللہ علیہ ، شیخ ،  
 ۱۳۷ : حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ ، ناگوری ، شیخ ،

## خ

- ۱۵۹ ، ۹۲ ، ۷۷ ، ۵۷ : خازن رحمۃ اللہ علیہ ، ابوسعید ، شیخ ،  
 ۷۲ : خسرو رحمۃ اللہ علیہ ، امیر ،  
 ۲۸ : خلیف بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ،  
 ۱۲۲ : خواص ، خان ،  
 ۱۲۰ : خورشید ، جاہ ، نواب ،

## ذ

- ۱۸۸ ، ۱۸۱ ، ۱۷۵ ، ۵۴ : ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ ، مصری ، شیخ ،

## ر

- ۱۳۲ ، ۱۳۳ : رضیہ سلطانہ ،  
 ۱۲۶ ، ۱۲۲ ، ۱۲۱ : رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ ، مظانی ، شاہ ،  
 ۵۷ ، ۲۹ : رود باری رحمۃ اللہ علیہ ، ابوعلی ، شیخ ،

۱۰۵ : رؤف احمد، مجددی، شیخ

## ز

۱۴۸ : زبیر رحمۃ اللہ علیہ، سرمندی، خواجہ :

۵۰ : زکریا علیہ السلام، حضرت ،

۱۱۶، ۱۱۷ : زین الدین رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :

## س

۶۸، ۷۷، ۱۶ : سراج رحمۃ اللہ علیہ، ابونصر، شیخ :

۱۰۱ : سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، عثمان، مولانا :

۱۴۱، ۱۰۵ : سرسید، احمد خان :

۱۸۵، ۱۸۴، ۹۲ : سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :

۹۸ : سعد الدین رحمۃ اللہ علیہ، حمویہ :

۱۹ : سعدی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :

۱۴۸ : سعد اللہ، خان :

۱۱۳ : سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ :

۱۴۲، ۴ : سلمان رضی اللہ عنہ، فارسی :

۱۴۸ : سلیم :

۱۴۸ : سلیم رحمۃ اللہ علیہ، چشتی :

۱۹۹ : سلیمان علیہ السلام، حضرت :

۴۸ : سمون رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :

۱۲۴ : سیف الدین :

۹۸ : سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ، حمویہ :

۲۳۵

## ش

- شاه جهان :
- ۱۲۹، ۱۲۳
- شہلی رحمۃ اللہ علیہ، ابوبکر، شیخ : ۵۳، ۱۴۲، ۱۴۸، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴
- شعرانی رحمۃ اللہ علیہ و عبد الوہاب :
- ۱۷
- شعیب علیہ السلام :
- ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۳۰
- شفیق رحمۃ اللہ علیہ، بلخی، خواجہ :
- ۱۹۸
- شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ، سہروردی، شیخ : ۱۷، ۲۹، ۵۱، ۶۳، ۷۷، ۸۱
- شہرستانی :
- ۷۸
- شیخ اکبر، محی الدین :
- ۸۸

## ص

- صالح علیہ السلام :
- ۱۲۹
- صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت :
- ۸۰

## ض

- ضیاء الدین، برنی، پروفیسر :
- ۱۰۳
- ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ، سہروردی، شیخ :
- ۱۴۶، ۷۷، ۵۱

## ع

- عارف، ارشاد احمد، سید :
- ۳۳
- عالمگیر، اونگ زب :
- ۱۲۷، ۱۲۳
- عائشہ رضی اللہ عنہا، سیدہ :
- ۱۳۱
- عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ، محدث دہلوی، شیخ :
- ۱۳۳، ۵۵، ۴۱

- عبد الحکیم، سیالکوٹی، مٹلا :  
 ۱۴۸، ۱۴۹
- عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ، ورائی :  
 ۱۶۳، ۱۶۲
- عبدالرحمان السلی رحمۃ اللہ علیہ :  
 ۱۷
- عبدالرحمان، مفتی :  
 ۱۷۳
- عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ :  
 ۲۰
- عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ، شاہ :  
 ۱۸۸
- عبد القادر، جیلانی، شیخ : ۱۷۹، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
- عبد اللطیف رحمۃ اللہ علیہ، برہان پوری، شیخ :  
 ۱۸۰
- عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما :  
 ۱۰۶
- عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ، جبائی :  
 ۷۷
- عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ، سید، حافظ :  
 ۱۳۷
- عبد الباقی رحمۃ اللہ علیہ، صدر الصدور، شیخ :  
 ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴
- عطار رحمۃ اللہ علیہ، فرید الدین، شیخ :  
 ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸
- علاء الدین، سلطان :  
 ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴
- علی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :  
 ۸۸
- علی بن الموفق رحمۃ اللہ علیہ :  
 ۱۸۹
- علی رضی اللہ عنہ، المرتضیٰ :  
 ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵، ۱۸۴
- علی رحمۃ اللہ علیہ، البحریری، شیخ : ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
- عمار رضی اللہ عنہ، حضرت :  
 ۴
- عمر بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ، المکی :  
 ۹
- عمر رضی اللہ عنہ، فاروق، حضرت :  
 ۱۸۰، ۱۱۳، ۸۰
- عیسیٰ علیہ السلام :  
 ۵۰

# غ

غزالی رحمۃ اللہ علیہ ، امام : ۱۸۳ ، ۱۷۴ ، ۱۶۲ ، ۱۶۲ ، ۱۱۴ ، ۱۱۳ ، ۹۲ ، ۷۷ :  
 غلام علی رحمۃ اللہ علیہ ، شاہ ، ۱۴۱ ، ۱۰۴

# ف

فاروق القادری ، محمد . سید : ۲۶  
 فضل رحمان ، گنج مراد آبادی ، شاہ ، ۱۵۰ ، ۱۴۰  
 فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ : ۱۱۲ ، ۱۱۱  
 فیروز جنگ ، خان : ۱۳۸

# ق

قرشی ، ابو عبد اللہ : ۱۶  
 قزوینی رحمۃ اللہ علیہ ، ابو علی ، شیخ : ۴۸ ، ۷  
 قشیری رحمۃ اللہ علیہ ، ابو القاسم ، شیخ : ۹۲ ، ۸۳ ، ۷۸ ، ۷۷ ، ۵۷ ، ۵۱ ، ۴۸ ، ۱۷ : ۱۹۸ ، ۱۹۷ ، ۱۹۶ ، ۱۹۳ ، ۱۸۴ ، ۱۷۹ ، ۱۷۸ ، ۱۵۸ ، ۹۳  
 قطب الدین ، سلطان : ۱۳۶ ، ۱۳۵  
 قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ ، کاشانی ، شیخ : ۱۳۴

# ک

کاکی رحمۃ اللہ علیہ ، بختیار ، خواجہ : ۱۳۴ ، ۱۳۶ ، ۱۳۴ ، ۱۰۷ ، ۷۳  
 کشلو ، خان : ۱۳۰  
 کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ ، دہلوی : ۷  
 کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا : ۱۰۱





- ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۰۴
  - ۱۲۴، ۱۰۱، ۹۹، ۷۳، ۲۹
  - ۱۷۴
  - ۱۱۴
  - ۷
  - ۷۸، ۷۷، ۱۷
  - ۱۱۳
  - ۷۸
  - ۱۱۲
  - ۱۵۹، ۱۵۰
  - ۱۲۹
  - ۱۲۹، ۱۳۹، ۱۳۳
  - ۱۱۹
  - ۱۲۷، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۷۳، ۶۸، ۷۱
  - ۶۸، ۶۶، ۶۲، ۲۹، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۸
  - ۲۰۵، ۲۰۳، ۲۰۲، ۱۲۷، ۱۳۶، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۰۱، ۹۸، ۷۳، ۷۲
  - ۱۳۹
  - ۱۲۳
  - ۱۵۸، ۱۵۶
  - ۱۳۹
  - ۱۲۳
  - ۱۲۳
- مصوم رحمۃ اللہ علیہ، محمد، سرسبندی :
  - معین الدین رحمۃ اللہ علیہ، چشتی - خواجہ :
  - مغاذلی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ :
  - مقتضی لامر اللہ، خلیفہ :
  - مقداد رضی اللہ عنہ، حضرت :
  - مکی رحمۃ اللہ علیہ، ابوطالب، شیخ :
  - مک شاہ، سلجوقی :
  - منصور رحمۃ اللہ علیہ، علاج :
  - منصور، خلیفہ :
  - موسیٰ علیہ السلام :
  - میان میر رحمۃ اللہ علیہ، قادری :
  - میر خور و رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ :
  - ناصر الدین، قباچہ :
  - نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ، چراغ دہلوی :
  - نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ، اولیاد، خواجہ :
  - نظام الملک، نواب :
  - نعمان، میر :
  - نوح علیہ السلام :
  - نور بخش رحمۃ اللہ علیہ، توکلی، پردیس :
  - نور الدین، سلطان :
  - نور الدین رحمۃ اللہ علیہ، مبارک، شیخ :

۲۴۰

و

۱۴۸ ، ۴۰ ، ۹۶ ، ۱۰ : ولی اللہ، محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ :  
 ۱۹۲ : وہیب بن عبد رحمۃ اللہ علیہ :

ہ

۱۱۲ ، ۱۱۱ : ہارون الرشید، خلیفہ :  
 ۴۳ : ہارونی رحمۃ اللہ علیہ، عثمان، خواجہ :  
 ۱۲۶ : ہاشم رحمۃ اللہ علیہ، گجراتی، پیر :  
 ۱۳۷ : ہالیوں، نصیر الدین، سلطان :  
 ۹۷ : ہنٹر، ولیم، سر، :  
 ۱۲۹ : ہود علیہ السلام :  
 ۱۲۲ : ہدیت خان شیروانی ،

ی

۷۸ : یافعی رحمۃ اللہ علیہ :  
 ۵۰ : یحییٰ (علیہ السلام)  
 ۱۶۰ : یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ :  
 ۵۹ ، ۵۸ : یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ، نیری، شیخ :

<http://t.me/Tehqiqat>